کرشن گوپال عابد

ایک دل سو گھاؤ

ایک دل سو گھاؤ

کرشن گوپال عابد

ماڈرن بک ڈپو
کاٹھور

پہلا ایڈیشن

پہلی بار ستمبر ۱۹۵۶ء

ماڈرن بک ڈپو، اشوک نگر کانپور سے شائع کی گئی:-----

انتظامی پریس کانپور میں طبع ہوئی

یونس دہلوی کے نام ـــــــ

جن کی محبت، خلوص، اور
دوست نوازی نے مجھے قعرِ گمنامی
سے نکال کر آسمانِ ادب کا ایک
ستارہ بنا دیا۔

مُصنّف کی دیگر کتابیں

جلن	ناول	شمع بک ڈپو۔ دہلی
گھائل	"	"
ستم	"	"
جہاں غم پلتے ہیں	افسانے	(زیر طبع)
سیوتی کی ایک کلی	"	(زیر طبع)

ان افسانوں کے تمام کردار، مقامات، واقعات اور ارادے فرضی ہیں اور ان کا کسی فرد، مقام، واقعہ یا ادارے سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی بھی مطابقت قطعی اتفاقیہ ہے۔ اور اس کے لئے مصنف یا پبلشر پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔

فہرست

ایک دل سو گھاؤ

دروازے پر تنہائی بیٹھ چکی تھی ۔ سرِ شام ہی گھر میں گیتوں کی صدائیں گونجنے لگتیں ، جوان جوان خوبصورت لڑکیاں جن کے ننھے ننھے سینوں میں نئے نئے کنوارے ارمان تھے ، دانتوں میں دوپٹے کے آنچل دبا دبا کر اٹکے اٹکے سروں میں گیت گاتیں ـــــ راہی کے ، پردیسی کے ڈھولا کے ، وہ گیت جو محبت کی ہلکی ہلکی آنچ میں تپ کر پرسوز بنے تھے ۔ وہ گیت جن کی ابتدا بھی دھڑکن تھی اور انتہا بھی ، وہ گیت جو رقت انگیز بھی تھے ، شعلہ بار بھی ، جن میں آنسو بھی تھے گلے بھی ، شکوے بھی ـــــ اُن جذبوں کے گیت ، جنھوں نے آسودگی نہ پائی اور اُن خوابوں کے گیت جو دور دیس کے خوبرو مردوں سے متعلق ہوتے ـــــ .....

اور تب نقرئی آوازوں میں ڈوبے ہوئے ان گیتوں کے ساتھ ہلکے ہلکے ڈھولک ڈھو بجتی اور ایک طلسم سا چھا جاتا ۔ سانولے سینے دھڑکنے لگتے اور خوابوں کے جزیرے آباد ہو جاتے ـــــ ..... اور نئی نویلی دلہنیں شرمائی سی میٹھی رہتیں ۔ اور بہوئیں بناؤ سنگار کر کے ان آوازوں میں اپنی آوازیں ملانے کی ناتمام کوشش کرتیں ۔ اور پھر بیچ بیچ میں لایعنی سی باتوں کے سلسلے چھیڑ دیتیں ۔ بڑی عمر کی عورتیں ان تمام گیتوں کو حسرت سے سنتیں ۔ کبھی ناک بھوں چڑھاتیں ۔ کبھی ناک پر انگلی رکھتیں کبھی ہونٹ سکیڑتیں اور کبھی ڈھولک کھینچ کر بے ڈھنگے پن سے دھپ دھپاتیں

اور ایک ہنگامہ سا مچا رہتا۔

یہ ہنگامہ بہت دنوں سے مچا ہوا تھا۔ اُس کی ماں بہت ارمانوں سے اُس کا بیاہ رچا رہی تھی۔ وہ ایک زمانہ سے اُس کے سر پہ سہرا دیکھنے کی آرزو میں جی رہی تھی۔ اور اب جب کہ یہ وقت آ پہونچا تھا……

اب تو بیاہ سر پر تھا —— بارات میں صرف چار دن باقی رہ گئے تھے —— اور یہ چار دن —— ……

کتنے سپنے، کتنے ارمان، کتنے ان چھوئے کنوارے جذبے، ان چار دنوں سے متعلق تھے۔ گیتوں کی محبوب سُروں کے مابین لرزتے، کانپتے، لجاتے وہ خواب —— …… وہ دولہا بنے گا۔ سر پہ پھولوں کا سہرا باندھے گا۔ گھوڑی پر بیٹھے گا۔ بارات چلے گی۔ ہنگامے ہوں گے، روشنیاں ہونگی، تمتماتے چہرے ہونگے۔ نئے ملبوس ہونگے، آتش بازیاں ہونگی۔ خوشیوں اور مسرتوں کے ہجوم ہونگے۔ اور وہ سب کچھ ہوگا، جن کے بارے میں وہ اتنے برسوں سے سوچتا آیا ہے۔

اتنے برس ——؟

ہاں! کتنا طویل عرصہ گزر گیا۔ اُس نے سوچا تھا وہ انتظار نہ کر پائے گا اس نے سوچا تھا وہ ہر بار کی طرح اس بار بھی ہار جائے گا۔ اپنی جذباتیت کے ہاتھوں شکست کھا جائے گا۔ مگر نہیں —— جیت اُس کی ہوئی۔ فتحیاب وہی رہا —— ……

اُس نے اپنے ہونٹ بھینچ لئے۔ سگرٹ کا آخری کش لگایا، اور اُسے بھی

دوسرے لاتعداد سگرٹوں کی طرح میز کے کونے سے مسل کر فرش پر پھینک دیا۔ ٹین اُٹھایا۔ ڈھکنا کھولا۔ مگر اُس کی اُنگلیاں خالی لوٹ آئیں۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ ڈبہ خالی تھا۔ وہ پیتی الماری کی طرف لپکا۔ وہاں بھی سگرٹ نہ تھے۔ سرہانے کے نیچے آتشدان پر، سگرٹ کہیں نہ تھے۔ وہ جھنجھلا اُٹھا۔ اُسے اپنے خیالات کے تسلسل کے لئے سگریٹ کی بے انتہا ضرورت تھی اور سگرٹ کہیں نہ تھے۔ ہاں! فرش پر، میز پر، ایش ٹرے میں، آتشدان پر، سگرٹوں کے بے انتہا ادھ جلے ٹکڑے پڑے تھے۔ اور راکھ ہر جگہ بکھری ہوئی تھی۔ اور خالی ڈبے لڑھکتے ہوئے، دیوار کے سہارے خاموش پڑے تھے۔ اور کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ اُس نے یکبارگی یہ سب دیکھا۔ آہ! اتنی سی دیر میں وہ کتنے سارے سگرٹ پھونک گیا۔

تب وہ اُٹھا۔ دریچے کے پاس آیا۔ اُسے کھول دیا۔ دھواں پھیلتا سکڑتا باہر نکلنے لگا۔ گیتوں کی آواز پائیں باغ کے سناٹوں کے کندھوں پر سوار اندر آنے لگی۔ اور پائیں باغ کے خیموں کے اوپر کا زرد چاند اس کا مونہہ چڑانے لگا۔

اس نے اپنے دکھتے ماتھے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑلیا اور آخری بار سوچنے لگا "جو کچھ وہ کر رہا ہے کیا ٹھیک ہے؟" ———

مگر یہ کیسی آواز تھی؛ جانے کہاں سے پیدا ہو کر یہ آواز اُس کے دل و دماغ پر چھاتی جارہی تھی؟ یہ آواز کیوں پیدا ہو رہی تھی۔ اس کا تو وہ مدتوں سے گلا گھونٹ چکا تھا۔ اُس وقت جب دنیا اور دنیا والوں نے اس کے تمام گیتوں کو کچل دیا تھا۔ اُن کنوارے۔ البیلے۔ مسرت بدوش اور خوبصورت جذبوں کو ہمیشہ کے

لئے موت کی سرد گود کے حوالے کر دیا تھا۔ اسوقت وہ آواز بھی ختم ہو چکی تھی، پھراب ــــــ اتنے عرصہ بعد ــــــ وہی آواز آ آ کر اس کے ذہنی سکون کو کیوں تہ و بالا کئے جا رہی تھی۔ کیوں ؟ کیوں ؟

اُس نے دریچہ کی چوکھٹ پر سر رکھ دیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ آنسوؤں کا کوئی سہما سا قطرہ پلکوں پر لرزنے لگا ــــــ "آہ وہ کتنا کمزور ہے، کتنا بے بس ــــ "

اور تب ناگاہ اُس کے پلکوں کے ڈھکنے چیر کر ارشاد اُس کے دل و دماغ میں گھس آئی ــــ ارشاد ــــ اپنی پوری رعنائیوں کیساتھ ــــ کائنات کا حُسن اپنے دامن میں سمیٹے ــــ ارشاد ــــ وہ حسین ننھا منا سا گیت جسے وہ مدتوں سے بھولنے کی کوشش کرتا آ رہا تھا۔ اُس کی روح کے سناٹوں نے اُسے پھر اُگل دیا تھا ارشاد ــــ ؟

ارشاد، اُس کی زندگی کا سب سے پہلا مکمل گیت تھی۔ مکمل افسانہ تھی۔ مکمل خواب تھی۔ اُس کی جوانی کا سب سے پہلا سنگ میل تھی۔ ارشاد نے اُسے وہ تمام جذبے عطا کئے تھے جو مرد کی زیست کا سہارا ہوتے ہیں۔ اس کے تصور میں ارشاد کے بہت سے روپ تھے۔ وہ ارشاد جو ننھی سی معصوم بچی تھی۔ اور اُس کے ساتھ مل کر گھروندے بنایا کرتی تھی۔ اور بچپن کے نامکمل انجانے کھیل کھیلا کرتی تھی، پھر وہ ارشاد جو اسکول جانے لگی تھی۔ اسکول کی گاڑی میں بڑی لڑکیوں کی طرح بیٹھ جایا کرتی تھی اور دوپٹے کے آنچل کو مضبوطی سے کانوں کے گرد لپیٹ دیتی تھی۔ پھر وہ ارشاد جس کے ہونٹ اُس کے سامنے آتے ہوئے حیا کے بوجھ سے تھر تھرا اُٹھتے تھے اور اُس کی غلافی پلکیں اُس کی

دو نیلی گہری جھیلوں والی آنکھوں کو ڈھاک لیا کرتی تھیں پھر وہ ارشاد ــــ ....
مگر کہاں تک گنا جائے، وہ تو اُس کی زندگی تھی۔ زندگی کا ایک ثانیہ بھی وہ اس کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ ــــ اُن کا گھر آمنے سامنے تھا دونوں نے ایک ساتھ ہی بچپن تیاگ کر جوانی کی حدود میں قدم رکھا تھا۔ دونوں نے ایک ساتھ ہی چند نئے تصورات کو دامن میں لپایا تھا۔ نئے عہد و پیمان کیے تھے۔ جب تک اُس کے ابو جان زندہ تھے، ارشاد کے گھر والے اُسکی بے انتہا عزت کرتے تھے۔ وہ بلا روک ٹوک اُس کے ہاں جایا کرتا تھا اور گھنٹوں ارشاد کے سامنے بیٹھ کر اُسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کرتا تھا۔ حسن و ناز کی اس ملکہ کو ــــ حتیٰ کہ وہ شرما جاتی تھی اور اُس کے سامنے سے ہٹ جاتی تھی۔ اور وہ اُسے باؤلوں کی طرح تلاش کرتا رہتا تھا۔

دونوں کے گھر والے ایک دوسرے کی محبت سے بخوبی واقف تھے۔ جوانی کے حدود میں بھی پہنچ جانے کے بعد بھی اُن کی دیوانگی بدستور تھی۔ چنانچہ ایک روز اُس کے ابو جان نے ارشاد کے ابا سے اُسے اُس کے لئے مانگ لیا۔

ان دنوں وہ دسویں میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

اسے یاد ہے۔ اس روز دونوں گھرانوں میں بہت ہنگامے ہوئے تھے۔ ان کی منگنی کی رسم بہت شان سے منائی گئی تھی۔ ارشاد کا اس سے پردہ کرایا گیا تھا۔ اس کے دوستوں اور گھر والوں نے بڑی دیر تک اسے ارشاد کا نام لے لے کر چھیڑا تھا۔ ارشاد کے ابا نے اُسے اپنے پاس بٹھا کر نہایت شفقت سے سونے کی ایک انگوٹھی دی تھی۔

ارشاد اس کی بنا دی گئی تھی ——— مگر ارشاد اس سے دور تھی ، اس کا دل ، اُس سے ملنے ، اسے دیکھنے اور اُس کی باتیں سننے کے لئے ترستا رہتا تھا۔

پھر چند مہینوں کے بعد ایک روز اچانک اُس نے اُسے دیکھا۔ اور وہ چونک پڑا۔ کتنی خوب صورت۔ کتنی بے پناہ خوب صورت۔ وہ اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ نظریں جھکائے۔ دوپٹے کے آنچل کو انگلیوں پہ لپیٹے ہوئے ، مجسم حجاب ، مجسم شباب۔

"ارشاد" ——— اُس نے کہا

حسن شرماتا رہا حسن لجاتا رہا۔

"تم کتنی بدل گئی ہو؟" ——— اُس نے اُس سے کہنا چاہا ——— "تمھارے یہ ہونٹ ، یہ بال ، یہ آنکھیں ، یہ جسم ، یہ حیا آلود انداز۔ آہ! ارشاد ——— تم ——— تم ——— ..... !" اُس نے بہت کچھ کہنا چاہا۔ مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ چپ چاپ سلگتا رہا۔

اور ارشاد اُس کے سامنے کھڑی لجاتی رہی۔

اور دو دل ایک وقت میں ایک ہی جذبے کے تحت ایک ہی بات سوچتے رہے۔ مگر زبانیں خاموش رہیں۔

اور اُسے محسوس ہوا جیسے کائنات کی حرکت تھم گئی ہے۔ فضاؤں کا جادو رک گیا ہے۔ آسمان کی تنویروں نے آنکھیں موند لی ہیں اور وہ دونوں ——— ارشاد اور وہ ——— خلاؤں کے مابین کھڑے ہیں اور دور تک کچھ بھی نہیں۔

—— اور دونوں کی آنکھیں بند ہیں اور دونوں ایک سرمدی نشہ میں چور ہیں۔

اُس کی سانسیں ہانپنے لگیں۔ اُس نے چاہا ارشاد کی چاندسی پیشانی کو چوم لے۔ اُس کے لانبے لانبے حسین بالوں کو جھلادے۔ اُس کے جسم کو اپنی بہنائیوں میں لے لے۔ اور ان خلاؤں میں اپنے آپ کو محلول کر دے۔

مگر ارشاد چلی گئی۔ ارشاد بہت دیر تک اُس کے پاس نہ رک سکی۔ ارشاد نے چند لمحوں کے لئے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ اور اُس نے وعدہ ایفا کیا مگر وہ اُس سے کہہ نہ سکا کہ "ارشاد! تم کس قدر بے درد ہو ــ! تمہارے وجود کے سہارے تو میں زندہ ہوں، کبھی کبھی مجھے اپنے چہرے کی ایک جھلک تو دیکھ لینے دو۔"

اس روز تو نہیں ہاں چند دنوں کے بعد جب ارشاد کو ایک خط پہنچا تو اُس نے اُس سے سب باتیں کہہ دیں۔ اور ارشاد نے جب خوب صورت لفظوں میں اُسے جواب دیا کہ وہ اُس سے ملتی رہے گی۔ تو اُس کی کائنات کا ذرّہ ذرّہ جھوم اُٹھا تھا۔

اُن دنوں وہ انٹرمیڈیٹ کا امتحان دے رہا تھا۔ ارشاد نے امتحان کی صبح اس کی جیب میں ایک ریشمی رومال رکھا تھا جس کے کونے پر اُس کا اور ارشاد کا نام کڑھا ہوا تھا۔

پھر اچانک ایک روز اُس کے ابوجان اُس کی امّی کو اور اُسے تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ اس روز وہ خوب رویا تھا۔ جب اُن کا جنازہ اُٹھا تھا۔ ارشاد نے اُس کے کندھوں پر اپنا کانپتا لرزتا ہاتھ رکھ کر اُسے سہارا دیا تھا۔

اور شاید یہ آخری بار تھی جب ارشاد کا لمس اُسے نصیب ہوتا تھا۔ ابوجان کی

اچانک موت کے بعد اُسے پتہ چلا تھا کہ اُنھوں نے اپنے پیچھے کچھ نہیں چھوڑا۔ اور اُسے اپنا اور امی کا پیٹ بھرنے کے لئے تعلیم کو منقطع کرنا پڑے گا۔ اور اپنے مستقبل کے ان خوابوں کو بھول جانا پڑے گا۔

مگر جس روز اُس نے کالج چھوڑنے کا ارادہ کیا اُسی روز ارشاد کا ایک خط آیا تھا۔ اُس نے اُس سے تعلیم جاری رکھنے کی التجا کی تھی۔

اس حکم کو وہ نہ ٹال سکا تھا۔ جس طرح بھی ہو سکا آدھا پیٹ کھا کر، پرانے گھسے کپڑے پہن کر اُس نے تعلیم کو جاری رکھا۔ ارشاد کے خط نے اُسے بہت ہمّت بندھائی تھی۔ اس کی امّی اور ارشاد کے ابّا نے اُس کا ساتھ دینا منظور کیا تھا۔ کیونکہ سب کو اُمید تھی بی اے کے بعد وہ اس لائق ہو سکے گا کہ اپنے خاندان کی گئی ہوئی عزّت کو لوٹا سکے۔

اس نے اونچے اونچے رنگ محل بنائے تھے۔ ارادوں اور خوابوں کے خولوں میں گھرا جب وہ بی اے کا امتحان دے رہا تھا اُس نے اپنی امّی کو یقین دلایا تھا کہ بی اے کے بعد جب اُسے اچھی سی ملازمت مل جائے گی وہ اُسے کہنیوں تک سونے سے لاد دے گا۔

مگر ہوا کیا؟ ——— بی اے کا امتحان ہوا۔ امتیازی نمبروں سے پاس ہو کر، اپنی لیاقت اور اپنی تعلیم کے زعم میں وہ نوکریوں کی تلاش میں نکل پڑا۔ بڑی افسری کے خواب دیکھنے کے بعد ایک روز جب وہ تھکا ماندہ دل گرفتہ گھر لوٹ رہا تھا اس نے سوچا اگر افسری نہیں تو اُسے معمولی سی نوکری تو ضرور مل جائے گی جس سے کم از کم وہ اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ بھر سکے گا۔

مگر وقت گزرتا گیا۔ وقت پر لگا کر اُڑتا گیا۔ اُسے نوکری نہ ملی۔ وہ دھکے کھاتا رہا۔ ایک اُمید کے بعد دوسری اُمید۔ دوسری کے بعد تیسری۔ تیسری کے بعد چوتھی مگر بچپن کے ریت کے گھروندوں اور ان اُمیدوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ اور وہ لُٹتا گیا۔ اُس کا چہرہ سوکھتا گیا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمتی گئیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ محنت فکر اور شرم کے مارے اُس نے باہر نکلنا چھوڑ دیا ——— اور یہ سارا عرصہ ارشاد کا تصور اُسے آس بندھاتا رہا۔ ظلمات کے اندھیروں کے درمیان روشنی کی ایک لکیر۔ مگر ایک روز ——— ....

ایک روز اُسے پتہ چلا کہ ارشاد کے ابا نے ارشاد کا نکاح کہیں اور کر دیا ہے۔ چونکہ وہ غریب ہے اور بے روزگار ہے اور اتنی مدت تک وہ ایک موہوم سی اُمید کے سہارے انتظار کرتے رہے اور وہ نالائق نکلا۔ کیونکہ اُسے کسی نے نوکری نہیں دی۔ وہ مہینوں سے سڑکوں کی خاک چھان رہا ہے۔ اور ایک نوکری نہیں تلاش کر پا رہا۔ اس لیے اس نالائق کے ہاتھ اپنی بھولی سی بچی کا ہاتھ دینے کے لیے وہ تیار نہیں۔ وہ اسے فاقوں مرتا نہیں دیکھ سکتے۔ کیوں کہ محبت روٹی نہیں دے سکتی۔ کیونکہ محبت غریبی کے دامن میں نہیں پل سکتی۔ اور وہ جس کے ہاتھوں ارشاد کو سونپا جا رہا ہے اتنا امیر ہے کہ ارشاد عیش کرے گی۔ ہزاروں میں کھیلے گی۔ سونے میں تلے گی۔ کیا ہوا اگر اُس کے بچپن کے خوابوں کو اُس سے چھینا جا رہا ہے۔ کیا ہوا اگر اُس کو جہیز میں آنسوؤں کے سمندر دیے جا رہے ہیں۔ کیا ہوا اگر اُس کا خاوند بڑی عمر کا ہے۔ مگر روپے میں بڑی طاقت ہے ——— اور خالد ———؟

اُس پر تو ظلم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ روشنی کی ننھی سی آخری لکیر کو بھی چھین

لیا گیا تھا۔ اب وہ کس کے سہارے زندہ رہتا ـــــــ چاروں طرف سے آئے طوفانوں نے گھیر لیا۔ آندھیوں نے اُس کے مسکن کے پرخچے اُڑا دیے۔ اور اُس سے کہا گیا کہ آنسو بھی نہ بہائے۔

پھر جس روز ارشاد دلہن بنی۔ وہ چھپ کر اُسے دیکھنے گیا تھا۔ دلہن کے لباس میں اُس کا شبیہہ بے طرح نکھر آیا تھا۔ مگر اس کی طرح وہ بھی سوگوار تھی۔ خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ ان آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا کہ وہ خودکشی کے اس خیال کو جو اُس کے ذہن پر قابو پا چکا تھا، بھول کر گھر لوٹ آیا تھا۔ مگر اُس کی خاموشی کی تہہ میں نفرت کے ہزاروں سمندر تھے ـــ .....

ارشاد کی رخصتی کے دوسرے روز اُس نے ارشاد کی چھوٹی بہن نجمہ کو دیکھا تھا۔ اُس وقت اسکی عمر پانچ برس کی تھی۔ اسے دیکھ کر اُس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ آ اُبھری تھی۔

اور اس بات کو آج کتنے ہی برس بیت گئے۔ اس اتنے سارے عرصہ میں زمانے نے کتنے رنگ بدلے۔ کل کا خالد جسے کہیں نوکری نہ ملتی تھی اور جس کے لیے کہا گیا تھا کہ وہ اوباش اور آوارہ ہے اور کبھی بھی اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا اور جس سے اُس کی محبوبہ کو چھین لیا گیا تھا۔ آج شہر کا ایک امیر ترین آدمی گنا جاتا تھا۔ لوگ اسے رشک کی نگاہوں

سے دیکھتے تھے۔ وہ اتنا امیر کیسے ہوا؟ کیوں کر ہوا؟ کسی کو بھی کچھ پتہ نہیں تھا۔ ہاں! ایک بات تھی شہر میں اس کی بہت عزّت تھی۔

پھر جب دولت آئی۔ کتنے ہی گھرانوں سے پیغام بھی آنے لگے۔ لڑکیاں روپوں کی طرح برسنے لگیں۔ مگر اس نے اپنی ہونٹوں سے کچی ہوئی مسکراہٹ کو واپس نہ لوٹایا۔ آج تک کسی نے کبھی اُسے مسکراتے نہ دیکھا تھا۔ اس لیے اتنی عمر گزر جانے کے باوجود بھی وہ ابھی تک کنوارا تھا۔

اس کی ماں نے ہزاروں مرتبہ رو رو کر کہا۔ دھمکیاں دے دے کر اُسے دلہن لانے کے بارے میں کہا۔ مگر اُس نے ہمیشہ انکار کر دیا۔ اس نے اسے تنہائی کے واسطے دیے۔ اتنی بڑی حویلی اُسے کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ مگر اُس نے ایک نہ مانی۔ وہ پتھر بن چکا تھا۔ کوئی جذبہ کوئی غم، کوئی احساس اُس پر اثر انداز نہ ہوتا تھا اس پر بُری طرح کلبیت سوار تھی اور ماں اب تھک ہار کر برسوں سے خاموش ہو چکی تھی۔ وہ اب اس سے کچھ نہ کہتی۔ وہ اس کے غم کو سمجھتی تھی۔ جو اس کی روح کی انتہائی گہرائیوں میں کہیں حلول ہو چکا تھا۔ جو چرکہ ارشاد کی جدائی نے لگایا تھا وہ ابھی بھرا نہ تھا۔ مگر اُسے موہوم سی اُمید تھی کہ شاید کبھی زمانے کے ہاتھوں یہ زخم مندمل ہو جائے۔ اس روز اس کا لال اس کی گود میں لوٹ آئے گا اس روز بہاریں لوٹ آئیں گی۔ اُس روز وہ عورت کے ہونٹوں کے لازوال تبسم کی خواہش کرے گا ——— وہ نہایت چاہ سے اُس روز کا انتظار کر رہی تھی۔

اور خالد نجمہ کے جوان ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

کیوں کہ اُسے انتقام لینا تھا اس سارے گھناؤنے سماج سے۔ ان رسوم سے اس کمینگی سے۔ ان انسانیت سوز و عدولوں سے۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ کب نجمہ جوان ہو گی۔

کب وہ اُس کے ہاں بیاہ کا پیغام بھیجے گا؟ اور دنیا کو چونکنے کا موقع دے گا۔ کب اس کے دل کی دہکتی ہوئی جوالا بجھے گی۔ کب ان لوگوں کو پتہ چلے گا کہ پیسہ ہی سب کچھ نہیں انسانیت بھی کچھ ہے۔

اور اب نجمہ جوان ہو چکی تھی۔ اُس نے اُسے دیکھا تھا۔ وہ ہو بہو ارشاد کا روپ تھی۔ —— وہی بل کھاتا ہوا جسم، وہی موج کی طرح اُبھر جوانی۔ وہی چہرہ، وہی نقش۔ ویسے ہی لانبے بال۔ اس نے اسکی آواز کی نغمگی بھی سُن لی تھی۔ اور ارشاد کی اور اس کی آواز میں مناسبت بھی تلاش کر لی تھی۔ نجمہ اب اس کے لیے ارشاد بن گئی تھی۔

جس روز نجمہ کے گھر شہر کے اس سب سے بڑے رئیس کا پیغام پہنچا تھا۔ ایک کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ نجمہ کے ابا خود دوڑے دوڑے آئے تھے۔ انھوں نے خالدے پچھلی تمام باتوں کو بھول جانے کو کہا تھا۔ اور کہا تھا کہ مرد کی عمر کبھی نہیں ڈھلتی کہ دراصل شادی کی عمر ہی یہی ہے کہ نجمہ کے ساتھ اُس کا رشتہ انہیں سر آنکھوں پر منظور ہے۔

اُس رات وہ ارشاد کو یاد کر کے بہت رویا تھا۔

وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا —— پہلے تو اس نے سوچا تھا کہ نجمہ کو بیاہ لانے کے بعد اس سے اسکے والدین کا ایک ایک بدلہ لے گا۔ اسے بھوکوں مارے گا۔ اور وہ تمام ظلم اس پر ڈھائے گا جو عین جوانی کی عمر میں اس پر توڑے گئے —— اور ٹھیک اسی طرح جیسے اُس کے ارمانوں کو کچلا گیا۔ وہ نجمہ کے خوابوں کو پائمال کرے گا۔ اُس کی جوانی کو پانی بنا کر بہائے گا۔

مگر جب اُس نے نجمہ کو دیکھا تھا۔ اُس نے طے کر لیا تھا کہ وہ بھول جائے گا۔ وہ سب بھول جائے گا۔ وہ بھی آخر انسان ہے اُس کا بھی دل دھڑکتا ہے۔ اب کہاں تک وہ

اپنے اوپر جبر کرے گا۔ اب وہ ارشاد کو اور اس ظلم کو اور اپنے ماضی کو بھول کر نجمہ کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کے آنچلوں میں اپنے آپ کو گم کر دے گا۔

اور وہ اس شادی کا منتظر تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس کے تمام خواب لوٹ آئے تھے۔ اور آنے والی دلہن نجمہ نہیں ارشاد ہے۔ وہی ارشاد جس کے ساتھ اُس نے بچپن اور جوانی کے دن گزارے

اب بارات کے صرف چار دن باقی تھے صرف چار دن —— .... وہ ایک ایک لمحہ گن رہا تھا کہ اچانک آج —— ....

شام کا وقت تھا۔ امی کے ساتھ بازار سے بہت سے ضروری لوازمات خرید کر آنے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں آکر کپڑے اُتار رہا تھا۔ نوکر نے ایک نوجوان کو اُس کے سامنے لا کھڑا کیا۔ جو بہت دیر سے اُسکی راہ تک رہا تھا۔

"کہئے —— !"

"آپ خالد صاحب ہیں —————— ؟"

"جی —— فرمائیے ——"

لڑکا جوان اور خوبصورت تھا۔ اچھا جسم تھا۔ صورت سے وہ شریف خاندان کا نظر آتا تھا۔ فراخ پیشانی تھی۔ جس پر بال بے ترتیبی سے پڑے تھے آنکھیں بڑی بڑی اور حسین تھیں

اور اُن سے حزن و ملال ٹپک رہا تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"فرمایئے ——" اُس نے اپنے الفاظ کا اعادہ کیا۔

اُس نے محسوس کیا کہ لڑکا اپنے اوپر بے انتہا ضبط کر رہا ہے۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے ہیں۔ جسم سلگ رہا ہے۔ لڑکے کے سینے میں کوئی راز ہے۔ جوش ہے۔ اس کا گلا رندھ گیا ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے کہہ نہیں پاتا —— وہ اُس کے قریب آگیا۔ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے بیٹھ جانے کیلئے کہا۔

تب یکبارگی لڑکا رونے لگا۔ سسک سسک کر رونے لگا۔ اپنے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر —— ....

اور جب طوفان ختم ہوا، جب ہچکیاں رکیں۔ لڑکے نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا تھا —— "آپ نے نجمہ کو کبھی دیکھا ہے ——؟"

وہ اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

اور لڑکا کہتا جا رہا تھا —— "خالد صاحب آپ نے اپنے آپ کو بھی کبھی دیکھا ہے؟ دونوں کی عمروں کے بیچ کی خلیج کو بھی محسوس کیا ہے؟ —— وہ نوخیز کلی ہے اور آپ —— .... آپ اُس کے حسن کے بہ صورت خریدار ہیں۔ ..... کیا آپ سمجھتے ہیں وہ آپ کے ساتھ خوش رہ سکے گی؟ اس کے ان خوابوں کا کیا ہو گا جو اس نے بچپن سے اب تک دیکھے؟ اس کی جوانی کا کیا ہو گا؟ اس کے حسن کا کیا ہو گا؟ آپ روپے کے زور سے اسے خرید کرنا سمجھتے ہیں آپ جب گئے —— نہیں —— خالد صاحب —— آپ بھول رہے ہیں غلطی کر رہے ہیں.....

"چلے جاؤ —— چلے جاؤ ——" اُس نے چیخ کر کتنی بار کہا تھا۔ "چلے جاؤ ——

نکل جاؤ ——" جیسے طوفان آ گئے تھے۔ ——

اور لڑکا کہہ رہا تھا "ہاں آپ امیر ہیں۔ آپ اُسے خرید لیں گے۔ مگر ان وعدوں کا کیا ہوگا جو اُس نے مجھ سے کئے؟ —— بتایئے —— بتایئے —— وہ تو میری بن کر رہنے کی قسم کھا چکی ہے پھر وہ آپ کی کیسے بن سکتی ہے؟ —— بتایئے بتایئے —— ...."

"چلے جاؤ —— چلے جاؤ ——" وہ چنگھاڑ رہا تھا۔

"اس لئے نا کہ میں غریب ہوں اور آپ کے پاس دولت کے انبار ہیں۔ مجھے مدتوں سے اچھا کھانا نہیں ملا۔ اور آپ ہر روز کئی آدمیوں کا کھانا کتوں کو کھلا دیتے ہوں گے اس لئے نا کہ میرے ہاتھ خالی ہیں۔ میں بے روزگار ہوں۔ اور آپ کے پاس میرے جیسے کئی نوکر ہیں۔ مگر کاش آپ میری جگہ ہوتے —— میری جگہ ہوتے ......"

اور سسکیاں —— ....

پھر یہ طوفان تھمے نہ تھے۔ اُس وقت سے اب تک یہ فقرے اُس کے ذہن میں متلاطم تھے —— "کاش آپ میری جگہ ہوتے ....." آہ ان لفظوں کے ساتھ کتنے اسرار پوشیدہ تھے۔ اُس کی زندگی کی کتنی الم ناک کہانیاں پوشیدہ تھیں۔ کتنے آنسو! کتنی ہچکیاں، کتنے لٹے ارمان —— ....

اور اس وقت سے اب تک وہ سگرٹ پہ سگرٹ پھونکے جا رہا تھا۔ سگرٹ ایک ایک کر کے ختم ہو چکے تھے۔ کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ باہر صحنک میں گیتوں کی آواز بھی دب گئی تھی۔ باہر پائین باغ میں مہمانوں کے لئے گڑے خیموں میں بھی خاموشی چھا گئی تھی۔ چاند بھی پچھلی طرف لڑھک گیا تھا۔ مگر یہ طوفان بدستور ہنگامے بپا کئے تھے۔ "کاش

آپ میری جگہ ہوتے ۔۔۔۔ ....."

آج مدتوں کے بعد زہ باں آنسو بہہ نکلے تھے۔

زخموں کے ٹانکے ٹوٹ گئے تھے۔

ناسور رسنے لگے تھے۔

پھر چار دنوں کے بعد جب بارات چلنے لگی۔ لوگوں کو دیر تک دولھا کی تلاش رہی خالد اپنے کمرے میں نہ تھا سب گھبرا گئے تھے۔ چہروں پر جب ہوائیاں اُڑنے لگیں اور مہمانوں میں افراتفری مچ گئی اور اندر عورتوں میں کانا پھوسیاں شروع ہو گئیں۔ اسی وقت ایک کار دروازے پر رکی اور لوگوں نے دیکھا کہ خالد کے ساتھ پھٹے بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس ایک نوجوان اور بھی ہے جسے وہ ہاتھ سے پکڑے کھینچے لیے آرہا ہے

اور جب بارات نجمہ کے گھر پہنچی خالد نے نجمہ کے ابا سے کہا "آپ نے شریف کا پیغام اس لئے ٹھکرا دیا تھا کہ وہ غریب اور بے روزگار ہے۔ مگر اب اس کے ساتھ نجمہ کو بیاہنے میں آپ کو کوئی انکار نہ ہوگا۔ اس کے نام میں نے اپنی آدھی دولت لکھ دی ہے اور اب وہ اتنا ہی امیر ہے جتنا کہ میں ۔۔۔۔ ارشاد کی بابت جو غلطی ہوئی تھی اُسے دہرانے کے بجائے میں نے سدھار لیا ہے۔ میرا کوئی بڑا بھائی موجود نہ تھا مگر شریف کا بڑا بھائی میں موجود ہوں ۔۔۔۔"

نجمہ کے ابا خالد کو گلے سے لپٹا کر رونے لگے۔ بہت سی اور آنکھیں بھی آبدیدہ ہو گئیں۔ اندر عورتوں نے دبی زبان سے کہا خالد فرشتہ ہے۔" مگر اس فرشتہ کے اندر چھپے ہوئے انسان کو کسی نے نہ دیکھا جو اب ایک کنارے جا کر اپنی بانہہ کو آنکھوں پر رکھے سسک رہا تھا۔

آہیں

وہ تلخی سے مسکرایا۔ اور کروٹ بدل کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ کالج کی محراب دار سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے وہ سب سے اونچی منزل پر آ پہنچا تھا۔ شفاف فرش خنک اور ننگا تھا۔ یہاں وہ تنہا تھا کوئی اُسے دیکھنے والا نہ تھا۔ وہ کوٹ ایک طرف پھینک کر فرش پر اوندھا لیٹ گیا اور اپنے رخساروں کو فرش سے رگڑ رگڑ کر کہنے لگا "میں ہار گیا۔ میں پھر ہار گیا" اُسے محسوس ہوا اپنی اس شکست پر اُس کی آنکھیں آنسو بہانا چاہتی ہیں۔ اور اس کا گلا رُندھ گیا ہے۔ اور اُس کا جسم ہلکے ہلکے کانپنے لگا ہے۔ مگر اُس نے اپنے آپ کو روکا۔ کپکپاتے ہونٹوں کو بھینچ لیا اور منہ سے اُمڈتی ہوئی چیخوں کو حلق کے اندر دبا لیا۔ اور ردِ عمل کے طور پر ایک تلخ مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر جاگ اُٹھی۔ اور وہ کروٹ بدل کر آسمان کو دیکھنے لگا۔

"رونا بزدلی ہے" اُس نے سوچا "اور میں بزدل نہیں" آج تک اُسے کامیابی کب ملی ہے جو آج ملتی۔ اور اب تو غم اور درد اُس کے ساتھی بن گئے ہیں۔ دنیا میں کوئی اُس کا اپنا نہیں۔ اسے کبھی کہیں سے پیار نہیں ملا۔ ہر بار جب اسے شکست ملی ہے۔ کالج کی عظیم عمارت کی اوپری منزل کی اس چھت ہی نے ہمیشہ اسے پناہ دی ہے۔ یہاں کبھی کوئی نہیں آیا۔ تمام لڑکے نچلی منزل میں بکھرے ہوئے لاتعداد کمروں میں اپنے اپنے لیکچر سننے کے بعد لاتعلقی سے چلے جاتے ہیں۔ اور دنیا کے دیگر مشغل

میں اپنے آپ کو گم کر دیتے ہیں۔ مگر اس کی اپنی زندگی میں کالج کی اس اوپری چھت کو بہت دخل رہا ہے۔ ہر بار جب اُس نے سکون کو تلاش کیا اُسے یہیں پر سکون ملا۔ یہیں اس اکیلی چھت کے ننگے فرش پر بارہا وہ گھنٹوں لیٹا رہا۔ اور اُسے ماں کی گود کا پیار ملا۔ یہیں اُس نے اپنے دل سے زور زور سے باتیں کیں اور اکیلے اور وسیع آسمان کو دیکھتے دیکھتے گھنٹوں گزار دئے۔

اور آج ایک بار پھر وہ ہار کر یہاں آیا تھا۔ محراب دار سیڑھیوں پر منزل در منزل چڑھتے ہوئے وہ جونہی یہاں پہنچا اُس نے دل کے غم اور شکست کے ردِ عمل کو اس تنہائی کے حوالے کر دیا۔ پھر اُسے نیرا یاد آ گئی۔ نیرا ہر جگہ اُس کی تلاش کر رہی ہو گی۔ وہ نیرا کو بغیر ایک لفظ بتائے یہاں چلا آیا تھا۔ وہ نیرا کی آنکھوں کی ہمدردی اور لبوں کے خاموش دلاسے، برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس نے کبھی کسی کی ہمدردی برداشت نہیں کی۔ جب کبھی وہ کوئی ہمدرد نگاہیں اپنے ارد گرد دیکھتا ہے۔ اُس کا غم جاگ اُٹھتا ہے۔ اس کے جسم میں اپنے سماج اور دنیا کے خلاف نفرت کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ کمزور نہیں بننا چاہتا۔ وہ سر اُٹھا کر چلنے کا عادی ہے اُس نے کبھی اپنی آہوں اور کراہوں کو ہونٹوں سے آگے بڑھنے نہیں دیا۔ خاموشی سے جلنے میں اُسے ہمیشہ مسرت ملی ہے۔

مگر آج وہ شرمندہ ہے۔ بیحد شرمندہ ہے۔ آج اسکی نخوت اور غرور کا سر جھک گیا ہے۔ آج اُس نے لوگوں کی ان تمام اُمیدوں کا گلا گھونٹ دیا ہے جو اُنھوں نے اس سے وابستہ کیں۔ آج اس نے اپنے ساتھ نیرا کا بھی سر جھکا دیا ہے اور اُس وعدے کو ایفا نہیں کر سکا جو اُس نے نیرا سے کیا تھا۔ آج وہ کیسے اُس

کو منہ دکھائے گا۔ آج وہ کیسے اپنے ساتھیوں اور اُن لوگوں کے درمیان سر اُٹھا کر چلے گا۔ آج وہ پھر ناکام رہا ہے۔ وہ ہار گیا ہے۔ بری طرح ہار گیا ہے۔

اُسے وہ وقت یاد آگیا۔ جب نیرا اُس کے ساتھ شامیانے میں بیٹھی تھی۔ میچ شروع ہونے میں کافی وقت تھا۔ اُس نے نیرا کی طرف دیکھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح خاموش تھی ویسے ہی پُر ناز۔ پُر تمکنت ــــ لمبی صراحی دار گردن اونچی اُٹھی ہوئی۔ بال قرینے سے آراستہ۔ بیچوں بیچ چمکتی کنواری مانگ۔ سر پہ ریشمی سرکتا ہوا آنچل۔ چہرے پر ملاحت۔ رعونت معصومیت ــــ اور ایک ایسا تقدس کہ آنکھ تک نہ ٹکے۔ وہ سب سے بے نیاز۔ بے تعلق۔ الگ تھلگ دیویوں کے سے جلال سے بیٹھی تھی۔ یا کم از کم اُسے ایسا ہی محسوس ہوا تھا۔ پچھلے چند دنوں سے وہ اس کے لیے ایک ایسا آسمان بن گئی تھی جسے وہ چھونا چاہتا تھا۔ خوابوں اور آرزوں کا ایک ایسا نشیمن۔ جس کے خیال نے اُسکی زندگی کو نور کے رنگ عطا کیے تھے۔

نیرا آنند کی بہن تھی۔ اور آنند اُس کا دوست تھا۔ نیرا اُسی سال ہائی اسکول کر کے اُن کے کالج میں داخل ہوئی تھی۔ نیرا کو اُس نے بہت بار دیکھا تھا۔ مگر اب اُس کا حسن بیحد نکھر آیا تھا۔ اُس کی آنکھیں بڑی بڑی، مہ وش، اور خاموش تھیں۔ وہ بیحد معصوم تھی۔ اُس نے گرلز اسکول سے ہائی اسکول کیا تھا اس کالج کی تمام باتیں اُس کے لیے نئی اور حیران کن تھیں۔ پہلے جب وہ اُس کے سامنے آتی تھی۔ وہ اُس کی طرف یوں ہی سرسری نظروں سے دیکھ کر اُس کی بات کا جواب مختصر لفظوں میں دیدیا کرتا تھا۔ مگر نیرا بہت تیزی سے اُس کی طرف کھنچی آرہی تھی۔ پھر یکایک ایک روز اُسے محسوس ہوا جیسے نیرا نے اُس کے دل و

دماغ پر قبضہ جما لیا ہے۔ یہ کیسے اور کیوں ہوا اسے کبھی بھی علم نہ تھا۔ اُس روز اُس نے نیرا کے جسم کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور اُسے محسوس ہوا یہی بے پناہ حسن ہر وقت اُس کے احساس پر چھایا رہتا ہے۔

اُن دنوں "انٹر کالجز کرکٹ ٹورنامنٹ" ہو رہی تھی۔ اُن کا کالج لگاتار تمام میچ جیتتا آ رہا تھا۔ بہت سے میچ جیتنے کا سہرا اُس کے سر تھا۔ اُس نے تقریباً تمام میچوں میں اچھا اسکور بنایا۔ تین بار سنچری بنائی۔ ایک بار اُس کے ایک سو اڑتالیس رنز نے کالج کی ٹیم کو ہارنے سے بچا لیا۔ یہ اُسی روز کا ذکر ہے۔

جب وہ کھیل کر آیا۔ اُس کے ساتھیوں اور کالج کے طلبا نے اُسے پھولوں سے لاد دیا۔ اور اُسے کندھوں پر بٹھا لیا۔ بہت دیر وہ ان لوگوں کے نرغے میں گھرا رہا۔ اُس نے بے انتہا لڑکوں کو آٹوگراف دئے۔ ٹیم کے کپتان نے اُس کے سر پر "کاؤنٹی" رکھ دی۔ پرنسپل نے اُسے دیکھ کر "ویل ڈن مائی بوائے" کہا اور جب وہ گرلز پویلین سے گزرا۔ اُس نے اپنا نام بہت بار سنا۔ اُس شام جب وہ "کالج کافی ہاؤس" سے نکلا۔ سیڑھیوں پر ہی اُسے نیرا مل گئی۔

"آپ" اُسے یکبارگی سامنے پا کر وہ چونک پڑی۔ اور ایک لاابالی کیفیت سے اُس کے مقابل کھڑی ہو گئی --- سرو قد --- "میں آپ کو تلاش کر رہی تھی"۔ اشتیاق بھرا لہجہ تمتماتا چہرہ۔ --- سلگتی آنکھیں۔

وہ ہنس پڑا --- "کیا بات ہے نیرا"؟

وہ غیر شعوری طور پر اس کے قریب آ گئی --- بہت قریب --- اُس کے کوٹ کے کالر کو پکڑ کر کہنے لگی --- آج میں بہت خوش ہوں --- بیحد خوش --- آج

میرا دل ناچ رہا ہے ۔ نہ جانے ......"

اور عین اسی وقت یکبارگی اُس نے اپنے بالمقابل نیرّا کا چہرہ دیکھا ۔ چہرہ جو شباب کی جولانیوں کی آماجگاہ تھا ۔ چہرہ جو اپنی خوب صورتی سے بے نیاز ، اپنے جادو سے بے خبر ، اُس کے اتنے قریب آگیا تھا ۔ اور وہ ہونٹ دیکھے جو پھولوں کی گلابی رنگت لیے کومتا سے بوجھل تھے ۔ اور وہ آنکھیں جو مہ وش تھیں ۔ جن پر لمبی پلکوں کا سایہ تھا ۔ جن میں جذبات اور مسرت کی تھرک تھی ۔ اور وہ چونک پڑا اور اُس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے قریب اُن جوان سانسوں کو محسوس کیا جن میں کھلتے ہوئے شگوفوں کی مہک تھی ۔ اور ایک غنائی جسم کی گدازیت نے اُسے ایک ایسا لمس بخشا جس سے اُس کا جسم رہ رہ کر کانپنے لگا ۔ وہ تعجب ، مسرت اور خوف کے ملے جلے اثرات سے اُسے دیکھتا رہا ۔ اور نیرا اسشرما گئی ۔ پلکیں جھک گئیں اور آنکھوں میں حجاب کے ڈورے اُبھرنے لگے ۔ اور دونوں نے ایک نیا اور عجیب جذبہ ایک ہی ساتھ محسوس کیا ۔ اور اس جذبہ کے اظہار کی جرأت نہ رکھتے ہوئے ، دونوں مڑے اور پہلو بہ پہلو سیڑھیاں اُترنے لگے ۔

"نیرا" بالآخر اُس نے کہا "کیا بات تھی ؟"

"وہ" اُس کے ہونٹ ذرا سے کھلے ۔ اُس نے اپنا نازک سا پرس کھولا اور پھولوں کا ایک خوشنما ہار اُس کی طرف بڑھا دیا "میں مبارک باد دینے آئی تھی !"

"مبارک ؟"

"ہاں ! جب آپ کھیل رہے تھے میرا دل اُچھل رہا تھا ۔ سب آپکی تعریف کر رہے تھے ۔ ہر طرف آپ کا چرچا تھا ۔ ایک ایک شاٹ پر لوگ تالیاں پیٹ رہے تھے

اور نہ جانے کیوں میرا سر فخر سے تنا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آپ کی وجہ سے میں بھی بے انتہا شہرت حاصل کر گئی ہوں۔ اور مجھے لوگ رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ کیونکہ لوگوں نے کئی بار مجھے آپ کے ساتھ دیکھا ہے۔ کیونکہ آپ ہمارے اپنے ہیں۔ کیونکہ آپ ــ ......

"نیرا؟" اُس نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

"ہاں! اب مجھے اپنے اس خیال پر شرم سی آرہی ہے آپ مجھے معاف کر دیجئے میں نے آپ کو کبھی غیر نہیں سمجھا۔ اسلئے میرے دل نے سمجھ لیا کہ ــ ......"

اس رات وہ سو نہ سکا۔ وہ نیرا کی بابت سوچتا رہا۔ اُس نے نیرا کو اس نگاہ سے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور آج یہ سب کچھ ہونے کے بعد اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے نیرا اُس کے دل کی ایک ایسی آرزو ہے جو مدتوں سے دل کے گوشہ میں خوابیدہ تھی پھر وہ نیرا کے بہت نزدیک آ گیا۔ اُس کے لیے نیرا زیادہ حسین ہوتی گئی یا شاید اُس کے پرکھنے کی نگاہ ہی بدل گئی۔ نیرا اُس کے احساسات پر چھاتی گئی جمال ہوتی گئی۔ نیرا اُس کی بہت بڑی کمزوری بن گئی۔ نیرا بے پناہ خوبصورت تھی۔

مگر وہ اپنی خوب صورتی اور اُس خوب صورتی سے پیدا شدہ تاثرات سے یکسر بے خبر تھی۔

اس روز کے بعد نیرا نے کبھی کسی موقع پر بھی اپنے جذبات کا اظہار نہ کیا۔ نہ جانے اُس کے دل میں اس کا کیا درجہ تھا! کیا وہ بھی اس بری طرح اس کی زندگی پر چھا گیا ہے یا نہیں! کیا وہ بھی راتوں کے گمبھیر سناٹے میں جاگ جاگ کر جوانی کے سپنے دیکھا کرتی ہے یا نہیں! اُسے کچھ بھی علم نہ تھا۔ نیرا شروع سے ہی اس کے ساتھ بے تکلفی سے پیش آیا کرتی تھی۔ وہ اس روز کے بعد کبھی اس بے تکلفی کی حد سے آگے نہ بڑھی۔ آنند کا جگری دوست ہونے کی وجہ سے نیرا کو اس پر بے حد اعتماد تھا۔ اس کے علاوہ نیرا اُس سے بے حد متاثر بھی تھی۔ اس کی شخصیت سے۔ اس کے کردار سے۔ اس کی باتوں سے۔ اس کی دولت سے۔ غرضیکہ اس طرح کی ہر چیز نیرا کے لیے نئی اور انوکھی تھی۔ نیرا اس کے ساتھ اُس کے گھر آنے لگی۔ کار پہ سیر کو جانے لگی۔ آنند کے بغیر بھی وہ گھنٹوں تنہا رہنے لگی۔ "کالج کافی ہاؤس" میں وہ دونوں عام طور پہ ایک ہی ٹیبل پر بیٹھتے۔ تھوڑے ہی دنوں میں نیرا اُس کی کائنات کی مرکز بن گئی۔

پھر "ڈسٹرکٹ لیگ" شروع ہو گئی۔ لیگ میں اُن کا کالج پہلی مرتبہ شامل ہو رہا تھا جب وہ لیگ کا پہلا میچ کھیلنے گیا۔ نیرا نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اُسے ایک بار پھر ویسے ہی چمپئن دیکھنا چاہتی ہے۔ مگر اس میچ میں اُس کا اسکور صفر تھا۔ اور نیرا کی آشاؤں پر اوس پڑ گئی تھی۔ اس سے اگلے میچ میں بھی تقدیر نے یاوری نہ کی۔ اُس نے نہایت احتیاط سے کھیلنا شروع کیا۔ مگر تیسرے اوور کا چوتھا بال "یارکر" بن کر آیا ۔ اور اُسکی وکٹیں اُڑ گئیں۔ اسکو اس بار کا بھی

صفر تھا۔ وہ گردن جھکائے پویلین کی طرف لوٹ آیا۔ اس روز پھر اُسے شرمندگی اٹھانی پڑی تھی۔ کرکٹ بھی دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح اُس سے بیوفائی برت رہی تھی!

اور آج تیسری بار وہ "ڈک" پر آوٹ ہوا تھا۔ آج اُس کی ٹیم کو اسکی بہت ضرورت تھی۔ پہلے چار کھلاڑی صرف بارہ رنز بناکر آوٹ ہو گئے تھے۔ اور ساری گیم کا دارومدار اب اُسی کے سر تھا۔ جب وہ بیٹنگ کیلئے جانے لگا تو کپتان اُس کے قریب آیا اور اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تم نے بہت بار ہمیں بچایا ہے۔ آج پھر ایسا وقت آگیا ہے۔ خدا کرے تم کامیاب ہو کر لوٹو۔" وہ محض مسکرا دیا تھا۔ اُسے صفر رنز کی "ہیٹ ٹرک" کا ڈر تھا۔ اگر اُس نے جلدی سے ایک یا دو رنز بنالیں تو اس کا "بھروسہ" لوٹ آئیگا۔ وہ نیرا کے قریب سے ہو کر گزرا تو اُس نے ایک چھوٹا سا ریشمی رومال اور دو چیونگ گم "اُسے دئے۔" "آپ فتحیاب ہوں" اُس نے آنکھوں میں التجائیں بھر کر دعا دی۔ لوگوں نے تالیاں پیٹیں۔ اور اُس کے ساتھیوں نے متفکر نگاہوں سے اس کے قدموں کی چال کو دیکھا۔

مگر وہ پہلے ہی بال پر واپس لوٹ آیا۔

ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ اور یہ خاموشی اُس کی روح کے دبیز پردوں پر افسوس اور ہمدردی بن کر حاوی ہو رہی تھی۔ شرم اور بےعزتی کے احساسات سے اُس کا جسم بےطرح کانپ رہا تھا۔ دنیا اُسکی نگاہوں میں ایک نقطہ بن گئی تھی۔ "اتنا اچھا کھلاڑی بار بار ناکام رہے۔ بیڈ لک۔ بیڈ لک۔" آوازیں۔ دلاسے اور ان آوازوں اور دلاسوں کی تاب نہ لا سکا تھا۔ جونہی وہ پویلین میں لوٹا۔ پیڈ وغیرہ اُتار کر کسی سے بات کئے بغیر خاموشی سے باہر نکل آیا۔ پیچھے کیا ہوا اُسے

اُسے کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ لمبی سڑک کو قدموں سے ناپتے ہوئے اُس نے سوچا "اِس سے تو مرجانا ہی اچھا ہے ——"

پھر وہ کالج کی اس اوپری چھت پر آکر ننگے فرش پر لیٹ گیا اور اُس کا جی چاہا وہ رونے لگے۔ مگر اُس نے اپنے آپ کو روکا۔

اب وہ نیرا کو کیا منھ دکھائے گا؟

پھر وہ کئی دن تک کالج نہ گیا۔ نیرا کو نہ دیکھا۔ دوستوں سے نہ ملا۔ اخبارات سے اُسے پتہ چل چکا تھا کہ اُن کا کالج وہ میچ جیت چکا ہے۔ لچھمن اور ٹیکات نے آٹھویں وکٹ پر ایک سو دس رنز بنائی تھیں۔ کرکٹ میں یہ عام طور پہ ہوتا ہے۔ اُن کی ٹیم کے آخری کھلاڑیوں نے ہارا ہوا میچ جیت لیا تھا۔ مگر وہ خود شرمندہ تھا۔ اُس کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ اُس نے سوچا اب وہ کرکٹ کھیلنا چھوڑ دے گا۔

چوتھے روز موتی کے ریستوران میں اس نے نیرا کو دیکھا۔

وہ سوچنے لگا۔ نیرا اسے کیا سمجھے گی؟ وہ آنکھیں بچا کر کاؤنٹر پر موتی سے باتیں کرنے لگا۔ نیرا کے ساتھ ٹیبل پر ایک لڑکی اور ایک لڑکا اور بھی بیٹھے تھے اس نے سوچا کہ اچھا ہوا نیرا تنہا نہیں۔ اپنے پیچھے وہ نیرا کی باتوں کی ملیح آوازوں اور ہنسیوں کے مدھم مدھم ہلکورے سنتا رہا۔ آہ۔ ان آوازوں اور ان ہنسیوں کے لئے اُس کے کان کتنے دنوں تک ترستے رہے۔ کتنی مدت تک وہ ان

آوازوں کا متلاشی رہا۔ نیند میں۔ خوابوں میں۔ ہر ہر لمحے ان آوازوں کا خیال اُس کے ذہن پر حاوی رہا۔ اور آج اس نے ان سے منھ موڑا ہوا ہے ــــ!

پھر نیرا نے اسے دیکھ لیا۔ وہ اُس کے قریب آئی۔ اُس نے اپنے کندھے پر اس کی انگلیوں کا لمس محسوس کیا۔ وہ اس کی طرف مڑا۔ وہ پوشیدہ نگاہوں سے اُس کے چہرے کی بہاریں دیکھنے لگا۔ وہ اُس کے ساتھ اُس کی میز کی طرف آیا۔ اُسے سیٹ آفر کی گئی۔ ساتھیوں سے اُس کا تعارف کرایا گیا۔

"یہ شیلا ہے"

"نمستے۔"

"یہ جیت ہے"

"نمستے"

"دونوں میرے کلاس فیلو ہیں"

"خوشی ہوئی ــــ بے حد خوشی ہوئی۔"

"آپ کی بہت تعریف سُنی تھی۔ ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ آج دیکھ بھی لیا"

"اوہ"

مبہم آوازیں۔ مدھم آوازیں ــــ نیرا کی ہنسیاں ــــ وہ سب دیکھتا رہا دیکھتا رہا۔ نیرا کو، اُس کے دوستوں کو، شیلا حسین اور بے حجاب لڑکی تھی جیت ایک لاپرواہ، ذہین اور خوب صورت لڑکا تھا۔ لمبا۔ آرٹسٹ نما۔ ماتھے پر بکھرے بال۔ نیرا نے بتایا کہ اس کے بچپن کا ساتھی ہے۔ دونوں ایک ہی

محلے میں رہتے ہیں۔ وہ اس کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

اگلے روز نیرا کالج کافی ہاؤس میں بہت دیر تک اُس کے ساتھ بیٹھی رہی۔ تین دن بعد کالج کی ٹیم فائنل کھیلنے جا رہی تھی۔ اُس نے کھیلنے سے انکار کر دیا۔ نیرا بضد تھی وہ کھیلے۔ مگر وہ انکار کر رہا تھا۔ نیرا نے کسی سے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ اُسے چار بجے جانا تھا۔ مگر جب تک وہ حامی نہ بھر لے وہ جا نہیں جا سکتی تھی۔ اُسے جلدی تھی۔ مگر وہ اسے اپنی پوزیشن سمجھا رہا تھا۔ اور نیرا اُسے کرکٹ کی تواریخ میں سے ایسی مثالیں بتا رہی تھی جب کھلاڑیوں نے ہمت نہیں ہاری اور فتحیاب ہوئے۔

"اور سب سے بڑھ کر" اس کا کہنا تھا "جب بار بار ناکامی کے باوجود بھی کالج کے انتخاب کرنے والوں نے اُسے چنا تھا تو انھیں اُس کی اہمیت کا احساس ہوگا تبھی تو ــــ ...."

شام کے چھ بج گئے۔

عین اُسی لمحے نہ جانے نیرا کو کیا ہوا۔ کہ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف آگئی وہاں جینت کھڑا تھا۔ وہی اُس روز والا لڑکا۔ نیرا اُس کے پاس بھاگ کر کھڑی ہوگئی دونوں چند لمحے باتیں کرتے رہے۔ پھر جینت چلا گیا۔ تیزی سے مڑ کر واپس لوٹ گیا۔

نیرا چند لمحے اُسی جگہ کھڑی اُسے جاتا دیکھتی رہی پھر واپس لوٹ آئی۔ اور اُسے محسوس ہوا کہ نیرا کے چہرے پر افسردگی کے بادل چھا گئے ہیں۔ وہ اُداس ہو گئی ہے اور اُس کے چہرے کی شگفتگی اور چہرے کا جمال ہلکے ہلکے سایوں کی زد میں آ گیا ہے۔

"کیا بات تھی؟" اُس نے پوچھا

نیرا کے ہونٹوں پر ایک افسردہ ہنسی جاگ اٹھی۔ جیسے وہ خالی الذہن ہو چکی ہو۔ وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر جب بولی تو اُسے محسوس ہوا اس کی آواز کی لطافت اور شیرینی آنسوؤں سے شرابور ہے اُس نے دھیرے سے کہا۔ "کچھ نہیں"

اُس شام وہ نیرا کو ساتھ لیکر ہال پر آ گیا۔ ہال پر پاٹھک اور راجندر اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ مگر وہ نیرا کے ساتھ خاموشی سے "کوالٹی" میں بیٹھا رہا۔ نہ جانے نیرا کو کیا ہو گیا تھا۔ شاید جینت کی کسی بات سے اُسے بے حد صدمہ پہنچا تھا۔ شاید اُس نے جینت ہی کو ملنے کا وعدہ دیا تھا۔ اور اُس کے پاس بیٹھے رہنے کی وجہ سے وہ اُس سے مل نہ سکی تھی اور وہ ناراض ہو گیا تھا۔

پھر میچ کا دن آ گیا۔ نیرا نے کہا تھا کہ وہ آئے گی۔ اُس نے کھیلنے کی حامی بھر لی تھی۔ ٹیم کے کپتان اور دوسرے کھلاڑیوں نے اُس کی بہت ہمت بندھائی تھی۔ خود پرنسپل صاحب نے اُسے سمجھایا تھا۔ ٹیکت جسے سب "ڈکشنری" کہتے تھے۔ دیویندر سنگھ "بریڈمین" اور سریندر سنگھ "ہٹن" کو ساتھ لے کر صبح ہی اُس کے گھر آ گیا تھا۔ اور چاروں اُس کی چھوٹی آسٹن میں بیٹھ کر میچ شروع ہونے سے تھوڑی دیر پہلے گراؤنڈ میں پہنچ گئے تھے۔ ہر طرف تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ اُن کے کالج کے پورے طلبا موجود تھے۔ مخالف ٹیم کے بھی بہت سے حمایتی دوسری جانب بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈسٹرکٹ لیگ کا فائنل دلچسپ ہوتا ہے۔ اسی سے ڈسٹرکٹ کے کھلاڑیوں کا انتخاب ہوتا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں بیٹھے تماشائیوں میں اُس نے نیرا کو بہت تلاش کیا مگر وہ نہ ملی۔

ان کا کپتان حسب معمول ٹاس ہار چکا تھا۔ مخالف ٹیم نے پہلے کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جب وہ فیلڈنگ کے لیے میدان میں اُترے۔ اُس وقت تک نیرا نہ آئی تھی۔ جب کپتان نے اُسے بلا کر گیند پھینکنے کے لئے کہا نیرا اُس وقت تک بھی نہ آئی تھی۔ جب اُس نے اپنے پہلے چار اووروں میں مخالف ٹیم کے تین بہترین کھلاڑیوں کو آؤٹ کیا۔ نیرا تب بھی نہ آئی تھی۔ لنچ تک اُس نے نیرا کا انتظار کیا۔ پھر اُس کا دل ٹوٹ گیا۔ نیرا اب نہیں آئے گی۔

مگر خلاف معمول کرکٹ کی دیوی آج پھر اُس پر مہربان تھی۔ اُس نے فرسٹ سلپ میں ایک شاندار کیچ لیا۔ پانچ آدمیوں کو آؤٹ کیا اور جب ان کے کھیلنے کی باری آئی تو سب سے زیادہ رنز بنائیں۔ آج کے گیم کے جیتنے کا سہرا اُسی کے

سر رہا۔ جب جیتنے کے لئے اُنھیں ستّر رنز کی ضرورت تھی۔ اور وہ کھیلنے کے لئے آیا تھا تو تمام چہرے مرجھائے ہوئے تھے۔ کسی کو اُمید نہ تھی کہ وہ اتنی دیر کھیل پائے گا۔ اُس نے نہایت آہستگی سے کھیلنا شروع کیا۔ گیند روکتا رہا۔ خودبخود رنز بنتی گئیں۔ سکور بڑھتا گیا۔ پھر ایک ایسا وقت آیا جب وہ بڑھ بڑھ کر بال کو پیٹنے لگا۔ اُس کی ہر شاٹ پر تعریف ہونے لگی۔ مخالف ٹیم کے جیتنے کے چانس کم ہوتے گئے۔ جب اُس نے "وننگ باؤنڈری" لگائی۔ اُس کے ساتھیوں نے اُسے اُٹھا لیا۔ اور خوشی سے ناچنے لگے۔ اُن کا کالج پہلی ہی دفعہ میں ڈسٹرکٹ چیمپین بن گیا تھا۔

خوشی اور دلوانہ مسرت کے ان لمحات میں بھی وہ نیرا کو یاد کرتا رہا۔ کاش نیرا آج ہوتی اور دیکھتی کہ اُس نے اُس کی خواہشات پوری کردیں۔ آج پھر ہر جانب اس کا چرچا ہو رہا تھا۔ مگر نیرا کہاں تھی؟ کہاں تھی نیرا؟

میچ ختم ہونے کے بعد دیر تک وہ جھکتا رہا۔ سونی۔ مدن۔ دیویندر۔ لال۔ وغیرہ کو باتیں کرتا چھوڑ وہ نیرا کو تلاش کرنے نکلا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کے پر لگ جائیں وہ نیرا کے پاس پہنچ جائے۔ اور اُسے یہ خبر سنائے۔ مگر نیرا اُسے کہیں نہ ملی نہ اپنے گھر۔ نہ اُن کے گھر۔ نہ ہوسٹل۔ نہ اپنی سہیلیوں کے ہاں۔ نہ موتی کے ریستوراں میں ———

اس کی بیتابی بڑھتی گئی۔ بے تابی اضطراب بن گئی۔ اضطراب ہیجانی کیفیت اختیار کر گیا۔ وہ دیوانہ وار اسے تلاش کرتا رہا۔ ڈھونڈھتا رہا۔

حتےٰ کہ رات کے سائے فضا میں تیرنے لگے۔

پھر یک بارگی "اسٹینڈرڈ بار" میں اُس نے نیرا کو دیکھ لیا۔ مگر وہ تنہا نہ تھی اُس کے ساتھ جیت بھی بیٹھا تھا۔ وہ لااُبالی کیفیت میں جونہی اُس کی ٹیبل کی طرف بڑھا اُس نے دیکھا کہ جیت وسکی پی رہا ہے۔ اور نیرا سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اُس کے پاس بیٹھی اضطرابی کیفیت میں اپنا پرس ہلا رہی ہے۔ اُنہیں دیکھ کر وہ وہیں رک گیا۔

"جاؤ" جیت کی آواز سنائی دی "جاؤ نا! مہیش تمھارا انتظار کر رہا ہوگا۔"

"جیت" نیرا نے کہا "تم سمجھتے کیوں نہیں؟ مہیش میرا کچھ نہیں۔ میرے سب کچھ تو تم ہو۔ مجھے سمجھنے کی کوشش کرو جیت — ......"

"تم مجھے بہلانا چاہتی ہو؟ جاؤ نیرا — جاؤ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ تاکہ یہ شراب میرے غموں کو دفن کر دے۔ جاؤ نیرا — مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں۔ میرے پاس ہے ہی کیا؟ جو تم پسند کرو گی؟ یہی میرا آرٹ، میرا فن، میری نادار محبت —؟ تم کہتی ہو کہ ہمیں بچپن سے ایک دوسرے سے محبت ہے۔ بچپن کا ساتھ کبھی نہیں چھوٹتا۔ مگر میں تو یہ نہیں کہتا۔ جوانی میں بہت سے لوگ کسی دوسری کشش کے زیر اثر بچپن کی باتیں بھول جایا کرتے ہیں۔ تم بھول گئیں تو کیا گلہ؟ ......"

"جیت۔ جیت۔" نیرا چیخ اُٹھی۔ "کیا تم مجھے کبھی معاف نہ کر سکو گے؟"

جیت ہنسا۔ ایک پھیکی ہنسی۔ "میں کون ہوتا ہوں معاف کرنے والا—"

افسردہ تبسم ۔۔۔ "تم پھر مجھے دھوکہ دینے کی کوشش کر رہی ہو۔ تمھارا ابھی دل نہیں بھرا؟ تم سمجھتی ہو تمھارے جھوٹے بہلاووں سے میں مان جاؤں گا۔ نہیں۔ نیرا نہیں اب تم چلی جاؤ۔ اب میں تم سے بہت دور چلا گیا ہوں۔ یہ شراب دیکھتی ہو۔۔۔؟ جسے میں نے کبھی نہ چھونے کی قسم کھائی تھی .... نیرا اب جاؤ ۔۔ ..... جاؤ ۔۔ ..... ۔۔ یہاں تمھارا بیٹھنا ٹھیک نہیں۔ جاؤ مہیش کے پاس، ورنہ وہ ناراض ہو جائے گا ۔۔ وہ بڑا آدمی ہے۔ بڑے آدمی کا لڑکا ہے۔ وہ ہیرو ہے۔ کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں کا محبوب ہے۔ خوب صورت ہے۔ اُس کے پاس کار ہے ۔۔ ...."

اُس نے شراب کا گلاس اپنے حلق کے اندر اُنڈیل دیا اور تلخی سے منہ بنا لیا۔

"یہ سب تمھاری نظر کا فریب ہے جیت ۔۔ تم کہتے ہو تو چلی جاتی ہوں۔ مگر یہ یاد رکھو میں تمھیں اس طرح اپنے آپ کو برباد نہ کرنے دونگی۔ اور ایک بات اور سن لو ۔ مہیش میرے بھائی کا دوست ہے۔ وہ مجھ سے بہت بڑا ہے۔ میں اُس کی عزت کرتی ہوں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں میں اُس سے محبت بھی کرتی ہوں۔ ۔ محبت مجھے تم سے ہے ۔۔ تم سے ۔ جو مجھے ٹھکرا رہا ہے۔" آنسو ۔ یہ ٹھوکر میرے دل کے شیشے کو چور چور کر رہی ہے۔ مگر میں تمھیں بھول نہیں سکوں گی۔" ۔ آنسو ۔ آنسو ۔

وہ کھڑی ہوگئی۔

جیت ہنسا۔ "نیرا دیوی پھر ملیں گے ۔۔ ٹاٹا۔"

نیرا نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ اور آنسو ضبط کرنے کی کوشش کی۔

"تم اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہو۔ یہ شراب محض ایک دھوکہ ہے۔ تم اپنے آنسو چھپانا چاہتے ہو ـــ تم شراب پی رہے ہو تاکہ میرے دل میں اپنے لئے نفرت پیدا کر سکو۔ مگر تم لوٹ کر آؤ گے۔ میں جانتی ہوں تم لوٹ کر آؤ گے ـــ میں جا رہی ہوں ـــ میں تمھارا انتظار کرتی رہونگی۔ تمہیں ایک روز خود بخود مجھ پر یقین آ جائے گا۔ اور تم دوڑے دوڑے آؤ گے (آنسو) میں جا رہی ہوں" (آنسو)

وہ چلی گئی۔ اور اس نے اُسے نہ روکا۔ اور وہ بیٹھا پیتا رہا۔ اس کے جانے کا اُس پر کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ تلخی سے مسکرا کر بیرے کو ایک اور پیگ لانے کا آرڈر دے دیا۔

عین اُسی لمحے وہ اپنے کوٹ کے کالر کھڑے کر کے اُس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

جیت اُسے دیکھ کر چونک پڑا۔ "مہیش صاحب آپ؟"

"ہاں میں! میں تم سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں"۔

"مجھ سے؟"

"ہاں تم سے ـــ نیرا کے متعلق۔ میرے ساتھ چلو"۔

"کہاں؟"

"باہر۔ نیرا کے پاس"

"جی نہیں۔ میں باہر نہیں چلوں گا۔ آپ کو جو کہنا ہو یہیں کہیے"۔

"تمہیں چلنا ہوگا جیت! ـ مجھے جو کچھ کہنا ہے میں نیرا کے روبرو کہوں گا۔ چلو۔ ابھی۔ اسی وقت۔ تم کسی کے دل کے کمل کو اس بیدردی سے

نہیں کچل سکتے۔ تمھیں اسکی تلافی کرنا ہو گی۔ تمھیں ۔۔۔۔۔۔" وہ رک گیا۔
وفورِ جذبات سے اُس کا گلا رندھ گیا۔

وہ اُسے ہاتھ سے پکڑ کر باہر کھینچ لایا۔

نیرا گیلری کے ایک کھمبے سے لگی رو رہی تھی۔ اُس کا دل آنسو بن کر بہہ رہا تھا۔ اس کا جسم سلگ رہا تھا۔ مدھم بجلیاں فضا میں مرتعش تھیں۔ باہر چاند اُبھر آیا تھا۔ ساتھ والے بال روم سے سازوں کی آوازیں آرہی تھیں۔

نیرا اُسے دیکھ کر چونک پڑی۔ "آپ؟" اس نے اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کی۔

"مجھے تم سے بہت شکایت ہے نیرا!"

"کیسی؟"

"تم میچ میں کیوں نہیں آئیں؟"

نیرا نے شرم سے پلکیں جھکالیں۔

"نیرا ۔۔۔ میں تمھیں ایک خبر سنانے آیا تھا۔ آج میں نے تمھارے ساتھ کیا ہوا وعدہ ایفا کر دیا۔ آج میں جیت گیا۔ آج میں چیمپئن رہا۔ آج میں نے کالج کو ہارنے سے بچالیا۔ تم یہی چاہتی تھیں نا؟ تمھاری یہی خواہش تھی نا؟"

"ہاں!" نیرا کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ "ہاں! میری یہی خواہش تھی کاش میں وہاں ہوتی ۔۔۔ کاش ۔۔۔۔۔۔"

وہ جیت کو اپنے پیچھے سے گھسیٹ کر سامنے لے آیا۔ "تم اسے جانتی ہو"
وہ شرما گئی۔

"پگلی" "تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟ آج میں نے تم دونوں کی باتیں سُن لی ہیں۔ جیت کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ مسٹر جیت! تم غلط سمجھے ہو۔ اب انسان بنو۔ نیرا مجھے عزیز ہے ــــ بے حد عزیز ہے۔ اسے میں تمہارے ہاتھ سونپتا ہوں۔ تم نے پھر کبھی اس کا دل دکھایا۔ تو میں تمہیں جھوڑ دوں گا۔ نیرا ــ آنسو بہانا چھوڑ دو۔ رونا بزدلی ہے۔ دونوں روٹھے ہوئے بچوں کی طرح من جاؤ۔ اور خاموشی سے میری کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ۔

جب نیرا اور جیت باہر لین کے سرے پر اُتر گئے۔ اور اندھیری گلی میں دو سایوں کی طرح مدغم ہو گئے۔ تو اسٹرنگ پر اپنا گھومتا ہوا سر رکھ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور سہمے ہوئے دو قطرے اس کی بند آنکھوں کے اوپر اُبھر آئے۔ اُس نے کتنا برداشت کیا؟ اُفوہ! اس نے اپنا دل اپنے ہاتھوں نوچ ڈالا۔ اپنی مسکراہٹ دوسرے کے آنگن کے اُجالے کے لیئے دے دی۔ اور عوض میں اُسے اندھیرے ملے۔

اس نے کار کا رخ موڑا۔ دروازے پر کار کھڑی کر کے وہ تیزی سے کالج کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ کالج کی عظیم عمارت اندھیرے کے آغوش میں محو خواب تھی۔ ایک بار پھر وہ ہار گیا۔ وہ جیتنے کی خبر سنانے گیا تھا اور شکست مول

لایا۔ یہ ہار ــــ یہ جیت ــــ ......

وہ کالج کی محراب دار سیڑھیوں سے اوپر ہی اوپر چڑھتا جارہا ہے۔

غمِ دل

۵۱

یہ بہار کی آخری رات کا ذکر ہے۔

کلب میں آج الوداعی رقص ہے۔ بہار کے آخری پھولوں کو یکجا کیا گیا ہے باہر درختوں پر خزاں کی آمد آمد ہے۔ پھولوں کے چہرے زرد پڑ چکے ہیں۔ پودے بیوہ کے سہاگ کی طرح لٹتے جا رہے ہیں۔ درخت اپنا سبزہ لٹا چکے ہیں۔ فضا پر پُرہول سناٹے مسلط ہیں۔ اور پوری رات کا چاند اپنا نور کائنات کے ناتمام اُجڑے اُجڑے حسن پر لٹانے کی ناکام سعی کر رہا ہے۔

یہ اُسی پوری رات کے چاند کا ذکر ہے۔

آج آخری بار اس چاند میں حسُن ہے۔ کل سے یہ چاند گھٹنے لگے گا۔ پھر دھند لکوں میں گم ہو جائے گا۔ خاموش ستارے آنکھیں بند کیے ٹمٹمائیں گے۔ جیسے وہ سجدے کر رہے ہوں۔ چاند کے آنے کی راہ تک رہے ہوں۔ تاریکی کی چادر کو جگہ جگہ سے ڈس رہے ہوں۔ اور جب اُن کے سجدوں کے صدقے پوری رات کا چاند نکلے گا تو فضا کا حسُن لٹ چکا ہوگا۔ اور یہاں سے وہاں تک طوفانی گرم ہوائیں شور مچائیں گی۔ نہ پھول ہونگے نہ رقص ہونگے۔ نہ بہار ہوگی۔ نہ نغمے ہونگے۔ نہ موسیقی اُبلے گی۔ اور کلب کی اس عظیم عمارت میں خاموشی کا ڈیرا ہوگا۔ رات کے آتے آتے چند انسان باہر پائیں باغ میں بید کی کرسیوں پر بیٹھ کر اُن دنوں کی باتیں کریں گے جب جوان

ہنگاموں، خوبصورت آنچلوں، کھنکتے قہقہوں، بے پرواہ ہنسیوں، محبت کی شعلہ بار نگاہوں، اور دلوں کی بے ہنگم دھڑکنوں سے کلب کی دیواریں حسن اور عشق کے دیوتاؤں کی طرح مسکرایا کرتی تھیں۔

یہ اُن مسکراہٹوں کا ذکر ہے۔

اُن مسکراہٹوں میں جوانی اور جوانی کے نغمے تھے۔ شرمیلی شرمیلی حیا بار کلیوں کی مسکراہٹ بھی شامل تھی۔ طوفانوں کی شدید لاأبالی مسکراہٹ بھی۔ ______ وہ مسکراہٹ بھی، جس کے بارے ہونٹ ہلکے ہلکے کانپتے تھے۔ وہ مسکراہٹ بھی جو بجلی کے رقص کیطرح یک دم آکر گم ہوجاتی تھی۔ وہ مسکراہٹ بھی جو دیر تک آپ ہی آپ ہونٹوں کے خمِ آلود کونوں میں لرزتی رہتی تھی۔

ایک ایسی مسکراہٹ نیلا کے پاس بھی تھی۔ نیلا کلب کے آسمان کا چاند تھی کلب کی دیواروں میں گونجتا ہوا سرمدی نغمہ تھی۔ اُس کے حسن میں عشوے تھے۔ جمال تھا۔ وہ ہزاروں دلوں میں ایک ساتھ پیدا ہونیوالی دھڑکن تھی ـــ....

مگر میں اُسے بھول چکا ہوں۔ سب بھول چکا ہوں۔ مدتوں سے بھولنے کی کوشش کرتا آرہا ہوں۔ اس کوشش میں میں نے اپنا سب کچھ لٹا دیا ہے۔ مجھے کہیں بھی سکون نہیں ملا۔ میرے غم کا مداوا کہیں نہیں۔ کہیں نہیں۔

اور آج بہار کی اس آخری رات میں پھر اکیلا ہوں۔ اکیلا ہونا میرے لئے قیامت سے کم نہیں۔ میں نے اس تنہائی سے بچنے کے لئے کیا نہیں کیا۔ ہر وقت اپنے گرد دوستوں کا ہجوم لگائے رکھنے کے لئے کوشاں رہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں یہ تمام دوست ہر وقت میرا انداق اُڑانے پر تلے رہتے ہیں۔ یہ میرے دل کے

درد کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ جسم کو دیکھتے ہیں۔ مادّی چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ روح تک اُن کی نگاہ نہیں پہنچ پاتی۔ مگر مجھے ان کی ضرورت رہتی ہے۔ میں ان کے درمیان وقتی طور پر اپنے غموں کو بھول جاتا ہوں۔ اس لئے مجھے اُن کی ہر دم تلاش رہتی ہے۔

مگر آج کی رات یہ سب مجھے چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ اور میں دیوانہ وار اُن کو تلاش کرتا پھر رہا ہوں۔ آج سارے زمانے نے مجھ سے مونہہ موڑ لیا ہے "مال" یہاں سے وہاں تک قہقہوں کی آماجگاہ بنی ہوئی ہے مگر میرے دل میں اندھیرا ہے۔ اور میں اس اندھیرے کا مداوا تلاش کر رہا ہوں۔ میں بیسیوں مرتبہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا مال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہو آیا ہوں اور مجھے کوئی مانوس صورت نہیں دکھائی دے رہی۔ میں کہاں جاؤں؟

تب یک بارگی کوالٹی کے سامنے مجھے راجندر مل گیا۔ راجندر ایک زمانہ کے بعد مجھ سے ملا ہے۔ جب سے میں نے کلب جانا چھوڑ دیا ہے۔ اُسے نہیں دیکھا۔ آج یوں یکایک مل جانے سے وہ بہت خوش ہے۔ وہ چاہتا ہے مجھے اپنے ساتھ کلب لے جائے اور میں انکار کر رہا ہوں۔ میں اپنے زخموں کو کریدنے سے بہت ڈرتا ہوں ــــــ ....

مگر میں انکار بھی تو نہیں کر سکتا۔ تنہائی سانپ کی طرح مجھے ڈسنے جا رہی ہے میں چپ چاپ راجندر کی کار میں بیٹھ گیا ہوں۔

اور راجندر نے اپنی کار کا رُخ کلب کی جانب موڑ دیا ہے۔

اور آج بہار کی آخری رات ہے۔

اور راجندر نے بتایا ہے کہ کلب میں آج الوداعی رقص ہے۔ بہار کے آخری پھولوں کو یکجا کیا گیا ہے اور پوری رات کے چاند کی شعاعوں میں آج آخری بار کلب میں ہنگامے ہوں گے۔

مگر میں اس کلب سے بہت ڈرتا ہوں۔ اس کلب میں میرے اُجڑے دیار ہیں میری وہ یادیں ہیں جو آنسو بن کر ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہیں۔ اس کلب میں میری زندگی کے وہ دن ہیں جنھیں خزاں کے جھونکوں نے مجھ سے بہت دور کر دیا ہے۔

اور آج راجندر زبردستی پھر مجھے اس کلب لئے جا رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے کوئی اور مل جائے اور میں کلب جانے سے بچ جاؤں۔ کاش مدن کسی کیفے سے جھانک کر مجھے دیکھ کر پکار لے۔ کاش ٹیکا کہیں سے آجائے۔ مگر میں جانتا ہوں ٹیک نہیں آئے گا وہ اپنی گاڑیوں کے ساتھ مصروف ہوگا۔ اور مدن! اُسے سونی اور لوگی وغیرہ زبردستی کہیں لے گئے ہوں گے۔ اور وہ مجھے اب نہیں ملے گا۔ اسے مجھے ساتھ نہ لیجانے کا بہت افسوس ہوگا۔ مگر وہ اس افسوس کو ظاہر نہ کرے گا۔ اور میں اس کی تلاش میں ایک ایک کیفے چھان چکا ہوں۔ اور میں اکیلا نہیں رہ سکتا۔

راجندر مجھے آج کی طرح پہلے بھی ایک بار کلب لے جا چکا ہے۔ یہ آج کی نہیں بہار کے شروع کے دنوں کی بات ہے۔

ان دنوں نیلا کلب کے آسمان کا چاند تھی۔

کلب میں جو بھی داخل ہو اُس کی نگاہ سب سے پہلے نیلا ہی پر پڑتی تھی۔ لمبی گردن کو فاخرانہ انداز سے اُٹھائے وہ ایک عجیب سی رعونت سے آتش دان کے کونے والی میز پر اکیلی ہی بیٹھا کرتی تھی۔ اس کی جانب ہزاروں نگاہیں اُٹھ چکی تھیں۔

مگر وہ ان سب سے بے نیاز اپنے آپ ہی میں گم رہتی تھی۔ کافی کے کپ سے نکلتے دھوئیں کو گھنٹوں دیکھتے رہنا اس کا دلپسند مشغلہ تھا۔ وہ اسے ہلکے ہلکے "سِپ" کیا کرتی تھی اسے کچھ بھی واسطہ نہ ہوتا تھا کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔ اس دوران بال روم کی موسیقی بار بار اپنی گت بدل کر ماحول کو ہزاروں شکلیں دے ڈالتی تھی۔ روشنی نیلی سے ہری۔ ہری سے سرخ۔ سرخ سے پھر نیلی۔ کبھی مدھم۔ کبھی دائروں کی شکل میں، کبھی معدوم اور کبھی موسیقی کی لہروں کے ساتھ بہنا شروع کر دیتی۔ مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔

کلب میں آنے والی ہر لڑکی اُس سے دوستی پیدا کرنے کی کوشش کر چکی تھی۔ روزی جس کی بھوکی نگاہیں ہر مرد کی جیب پر پڑتی تھیں۔ کٹی جسے اپنے ساتھ اپنے چار بھائیوں کا پیٹ بھرنا ہوتا تھا۔ شبنم اور گیتا جو ہر لمحہ میز یں بدلا کرتی تھیں اور دوسری تمام لڑکیاں جو لڑکیاں کم اور عورتیں زیادہ تھیں، پھر کلب کے ممبروں کے ساتھ آنے والی تمام سوسائٹی گرلز۔ پھر وہ بیویاں جو اپنے خاوندوں کے ساتھ آتی تھیں اور اپنے خاوند کے علاوہ ہر دوسرے مرد کے ساتھ رقص پر آمادہ ہو جاتی تھیں۔ پھر وہ ممیاں جو اپنی نوعمر لڑکیوں کی رکھوالی کرنے آتی تھیں اور اپنی لڑکیوں کے بجائے ادھیڑ عمر کے دوسرے مردوں کے ساتھ ماضی کو آوازیں دے دیکر بلایا کرتی تھیں —

مگر نیلا ان سب سے بلند تھی — بہت بلند —

یہ تمام باتیں مجھے راجندر نے بتائی تھیں۔ راجندر نے مجھے کلب لاتے ہوئے کہا تھا کہ نیلا ایک ایسا چاند ہے جو آسمان میں ہے۔ جب کہ ہم سب زمین پر رینگتے ہوئے حقیر کیڑے ہیں۔

میں اُس کی باتیں سن کر ہنس دیا تھا۔ اور اُسے دیکھنے کے اشتیاق میں کلب آگیا تھا۔ اور عین اُس کے کہنے کے مطابق سب سے پہلے میری نگاہ نیلا پر ہی پڑی تھی۔
میں نے کہنی مار کر آہستہ سے اُس سے پوچھا "وہی ہے"؟
"ہاں!" راجندر نے کہا تھا۔
اُس روز میں نے نیلا کے ہونٹوں پر پہلی بار وہ مسکراہٹ دیکھی تھی جو اُس کے ہونٹوں سے مخصوص تھی۔ جو ایک بار ہونٹوں پر آجانے کے بعد دیر تک آپ ہی آپ خم آلود کونوں میں ناچتی رہتی تھی۔
وہ مسکراہٹ مجھے بیحد عجیب لگی۔ میں سب کچھ بھول کر اُسی مسکراہٹ کو دیکھتا رہا۔ وہ مسکراہٹ میرے ذہن کے آنچل سے چپک کر رہ گئی۔ وہ مسکراہٹ میری زندگی کا چراغ بن گئی۔ میں اس مسکراہٹ سے اتنا مرعوب ہوا کہ ہزار کوششوں کے باوجود بھی اس مسکراہٹ کو نہ بھول سکا۔ میری زندگی کا ایک ایک لمحہ اس مسکراہٹ کی نذر ہوگیا۔
میں نے راجندر کے ساتھ روز کلب جانا شروع کر دیا۔ میں خود بھی اس کلب کا ممبر بن گیا۔ میری دیوانگی بڑھتی گئی۔ میں لوگوں سے بہت پہلے اُس کے انتظار میں آکر بیٹھ جاتا اور جب وہ آتی اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ سے اپنے اندر کے جذبوں کو سلاتا رہتا۔
میں آہستہ آہستہ سب کچھ بھول کر اُسی مسکراہٹ کے سہارے زندہ رہنے لگا۔
شروع شروع میں میں نے اسکی خاموش پوجا کی۔ پھر میں بھی کلب کا ایک اہم فرد بن گیا۔ میں بھی آہستہ آہستہ اُس کی جانب بڑھنے لگا۔ بڑھنے لگا۔
اور بالآخر میں اُسے اس بات کا احساس دلانے میں کامیاب ہوگیا کہ میں اُسکی

مسکراہٹ کے سہارے جیتا ہوں۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ایک روز آپ ہی آپ یہ مسکراہٹ مجھے مل گئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ ایک خوب صورت رات وہ خود میرے قریب سے ہو کر گزری تھی۔ اور اُس نے نگاہ اُٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔

پھر ایک روز جب باہر بارش ہو رہی تھی۔ کلب کے ہنگامے ختم ہونے کے باوجود کوئی رخصت نہ ہو سکا تھا۔ شیشے کی بڑی بڑی دیواروں کے باہر پانی کے طوفان تھے۔ تمام لوگ بہت دیر سے ان طوفانوں کے رکنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں بہت دیر سے نیلا کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ وہ نگاہیں جھکائے بے صبری سے رخصت ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ آج بہت دیر ہو گئی تھی۔ نہ جانے کتنی رات گزر چکی تھی۔ میں باہر برآمدے میں آکر کھڑا ہو گیا۔ اور تاریک آسمان کو گرجتے، اور پانی کے سیلاب کو برستے دیکھنے لگا۔

ناگاہ مجھے احساس ہوا کوئی میرے قریب آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ بہت قریب ـــــ میں نے چونک کر دیکھا نیلا تھی۔

میرا دل دھڑکنے لگا۔ شاید اُسے میری موجودگی کا احساس نہ تھا۔ شاید وہ بھی میری طرح اندر کے ماحول سے اُکتا کر باہر بارش کا نظارہ دیکھنے چلی آئی تھی۔

اندر موسیقی کی آوازیں مدھم ہو چکی تھیں۔ سب لوگ بے پرواہی سے میزوں پر بکھرے ہوئے بے ہنگم باتوں میں مصروف تھے۔

میرا دل اُسکی موجودگی کے احساس سے دھڑکتا رہا۔ دھڑکتا رہا۔

تب یک بارگی آسمان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک بجلی کوند گئی

اور ایک ثانیہ کیلئے ہماری نگاہیں چار ہوئیں ۔

"آپ — ؟" میں نے جیسے چونک کر کہا ۔

"جی" مترنم آواز

اور اس رات دیر تک ہم ایک دوسرے کے قریب کھڑے رہے ۔ دیر تک ایک دوسرے کی موجودگی کے احساس سے سلگتے رہے ۔ اس رات میں نے محسوس کیا ۔ میں نے آسمان کے اُس چاند کو چھو لیا ہے ، جسے راجندر کے کہنے کے مطابق کوئی چھو نہیں سکتا تھا ۔

اُس رات اور اُس رات کے بعد اور بہت سی راتیں ——— نیلا کی رعونت پگھلتی گئی ۔ اُس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ کے ستارے میرے دامن میں سمٹتے گئے ۔ ایک میٹھی میٹھی مسکراہٹ آہستہ آہستہ میرے قریب آتی گئی ۔

اور میری زندگی جیسے جھوم اُٹھی ۔ گیتوں سے ۔ نغموں سے ۔ دھڑکنوں سے ———

وہ جوان ۔ رعنا ۔ جمیل دوشیزہ میری بن گئی تھی ۔ صرف میری ——— ....

اور ایک رات جب فضا میں بہار کے ہنگامے تھے ۔ وہ اپنے مخصوص پیرے اُٹھ کر میرے ساتھ بال روم میں آکر ناچی ۔ جی بھر کے ناچی ۔ اس روز میں نے بے حد اصرار کے بعد اُسے اس بات پر راضی کیا تھا ۔

اور اُس رات لوگوں نے دیکھا کہ نیلا کے جسم میں شرارے بھی ہیں ۔ وہ لگاتار ہنس بھی سکتی ہے ۔ نقرئی قہقہے بھی اُگل سکتی ہے ۔ ایک مرد کی باہوں میں گھنٹوں رقص بھی کر سکتی ہے ۔ حسن اور عشق کی فضاؤں میں اپنے آپ کو گم بھی کر سکتی ہے ۔ باہر بالکونی میں ایک مرد کے ساتھ چاند کی طرف بھی دیکھ سکتی ہے ۔ پائین باغ میں

اُس مرد کے کندھوں پر سر رکھ کر مسکرا بھی سکتی ہے۔

اور میں خوش تھا۔ بے حد خوش۔ دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان۔ میں نے آسمان کے چاند کو اپنی باہوں میں لے لیا تھا۔ لوگ مجھ پر رشک کرنے لگے تھے۔ ایک روز راجندر نے مجھ سے کہا تھا "تم ہیرو ہو" میرے دوست میرے ساتھ بات کرنا فخر سمجھتے تھے۔ میں کلب کی سب سے اہم شخصیت تھا۔ میرے بغیر تمام محفلیں سونی تھیں۔ تمام پروگرام ادھورے تھے۔

اور یہ تمام نیلا کی وجہ سے تھا۔

یہ اُن دنوں کی باتیں ہیں جب بہاریں جوان تھیں۔

مگر اب تو کچھ بھی نہیں۔ اب تو سب ختم ہو چکا ہے۔ اب تو میرا دامن مدتوں سے خالی ہے۔ ہر آدمی جانتا ہے کہ میں ایک شکست خوردہ، ناکام انسان ہوں۔ ہر آدمی مجھے رحم کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ تمام دنیا جانتی ہے کہ میں نے محبت کی۔ اور ناکام رہا۔ یہ ناکامی ہر محبت کا مقدر رہا ہے۔ ہر محبت کی کہانی کا انجام تقریباً ایسا ہی ہوتا ہے۔ ــــــ ....

مگر میں نے تو اُسے حاصل کرنے کے لئے جان دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔ میں تو اُس کے لئے سارے زمانے سے لڑ گیا تھا۔ مگر اُس کا باپ لکھ پتی تھا۔ اور اُس نے اُس کی شادی ایک دوسرے لکھ پتی سے طے کر دی تھی۔ اس کے نزدیک لکھ پتی ہونا سب سے بڑا وصف تھا۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا روپے کی جھنکار دنیا کی تمام خوشیوں سے بالاتر ہے۔ وہ محبت کو ایک ڈھکوسلا سمجھتا تھا اور یہ بات ماننے سے منکر تھا کہ محبت ایک ایسی اٹل سچائی ہے جہاں سے تمام مسرتوں اور خزانوں کے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔

مگر ہم چپ نہ رہ سکے تھے۔ ہم چیخے تھے۔ چلّائے تھے۔ میں نے سارے زمانے کو چیخ چیخ کر اپنی محبت سے آگاہ کر دیا تھا۔ مگر میری ہر آواز دبا دی گئی تھی۔ اور میری تمام آرزوؤں کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ مجھے وہ رات بھولی نہ تھی جب نیلا میرے پاس آئی تھی۔ اور رو رو کر کہا تھا "مجھے بدنام نہ کرو"۔

میں اُس رات سن سا رہ گیا تھا۔ نیلا نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ کل اُس کی شادی تھی۔ اُس نے اپنے آنچل میں ان خوشنما تاروں کو باندھ لیا تھا۔ اور مجھے عمیق اندھیروں میں ڈھکیل دیا تھا۔ اور مجھ سے کہا تھا "مجھے بدنام نہ کرو"۔

اور میرے آنسو میری آنکھوں میں ہی جم کر رہ گئے تھے۔ مجھے آہ کی بھی اجازت نہ دی گئی تھی۔ میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اُسے بدنام نہ کروں گا۔ چپ رہوں گا اور اپنے آپ جلوں گا۔ مگر کوئی ایسی بات نہ کروں گا جس سے اُس کی عزّت پر حرف آئے۔

اس بات کو بھی بہت دن گزر گئے۔

میں نے اپنے زخموں پر زمانے اور وقت کی مرہم لگا دی تھی۔

میں اپنا تمام وقت اِدھر اُدھر دوستوں کے بیچ کاٹ دیا کرتا تھا۔

مگر آج راجندر نے پھر میرے زخم چھیڑ دئیے ہیں۔ آج بہار کی آخری رات ہے۔ آخری پھولوں کو یک جا کیا گیا ہے۔ راجندر مجھے یہاں گھسیٹ لایا ہے۔ شاید وہ سمجھتا ہے۔ میں بھول گیا ہوں۔ سب بھول گیا ہوں۔

اور میرا دل دھڑک رہا ہے۔ میں آنے والے امتحان کا انتظار کر رہا ہوں۔ اور چپ چاپ اپنی میز پر بیٹھا ہوں۔ رقص شروع ہونے میں ابھی کافی وقت ہے۔

راجندر نے میرے لئے شراب کا آرڈر دے دیا ہے۔

میں نے اس رقص میں شامل ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ میری آنکھوں کے گرد حلقے دکھنے لگے ہیں۔ میرے ذہن میں سائیں سائیں ہوائیں چل رہی ہیں۔ میں شراب پی رہا ہوں۔ اپنی تنہائی اور اپنے غم اور اپنی یادوں کو بھولنے کے لئے پیگ پر پیگ چڑھا رہا ہوں۔

راجندر رقص کے شروع ہونے کا منتظر ہے۔

اور آج بہار کا آخری رقص ہے۔ آج کے بعد بہار ختم ہو جائے گی۔ پھولوں کے پودے مرجھا جائیں گے۔ کونپلیں سوکھ جائیں گی۔ درختوں کے پتے جھڑ جائیں گے گرم ہوائیں فضا میں گرد اڑائیں گی۔ اور بہار کا ایک گیت بھی باقی نہ رہے گا۔

راجندر بار بار کہہ رہا ہے۔ آج بہار کا آخری روز ہے۔

اور میرے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ جاگ اٹھی ہے "بہار ہے ہی کہاں راجندر؟ بہار ہے ہی کہاں؟ اپنی زندگی سے تو بہار مدتوں سے رخصت ہو چکی ہے۔ اب تو خزاں ہی خزاں ہے؟"

اور ایک گیت بار بار کہہ رہا ہے "بہار پھر آئے گی۔ آج بہار ختم ہو رہی ہے مگر یہ بہار لوٹ آئے گی۔ بہت جلد لوٹ آئے گی۔ بہت جلد پھر پھولوں پر نکھار آئے گا۔ بہت جلد پھر کونپلیں پھوٹیں گی"

اور میں شراب کے تلخ گھونٹ اپنے حلق کے اندر انڈیلتا جا رہا ہوں۔

راجندر کو امید ہے بہار لوٹ آئے گی۔

تمام انسانوں کو امید ہے بہار لوٹ آئے گی۔

آرکسٹرا بار بار گا رہا ہے۔ بہار لوٹ آئے گی

اور میں سوچ رہا ہوں "اے بہار کے نغمے۔ جو بہار دم توڑ چکی۔ اُس میں پھر سے زندگی کہاں سے آئے گی۔"

راجندر مجھے باہر ٹیرس پر لے آیا ہے۔

رقص شروع ہونے والا ہے۔

میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ شاید میں نیلا کو بھولتا جا رہا ہوں۔ شاید میں بھی نشے کے اس طوفان میں بہتا جا رہا ہوں۔ شاید میں بھی انسانوں کے اس پُر مسرت ہجوم میں شامل ہوتے جا رہا ہوں۔ شاید مجھے بھی اُمید ہوتی جا رہی ہے کہ بہار آئے گی۔

اور میں تلخ مسکراہٹ کو روکنے کے لئے بار بار ہونٹ بھینچ رہا ہوں۔

ہر طرف پھول ہی پھول ہیں۔ ایک عورت پھولوں سے لدی پھدی ناچنے کے لئے تیار ہے۔ میں بھی سوچنے لگا ہوں زندگی کتنی حسین شے ہے۔

راجندر میرے پاس سے اُٹھ کر دوسری ٹیبل پر چلا گیا ہے۔ شاید وہ بھی اپنے لئے کوئی پھول چننے چلا گیا ہے۔

مگر اب مجھے اُس کے جانے کی پرواہ نہیں۔ اب تنہائی مجھ پر بوجھ بن رہی ہے۔ اب میں ہنس سکتا ہوں۔ گا سکتا ہوں۔ لوگوں کی سر میں سر ملا سکتا ہوں۔

میرے اندر کا مدتوں سے محروم انسان آج جاگ اُٹھا ہے۔ آج اُس نے اُس انسان کو مار دیا ہے جو ہر دم جلتا رہتا تھا۔ جو بزدل تھا۔ جو ایک وعدے کے سہارے آج تک زندہ ہے۔ آج میں بھی بہاروں کے اس گیت میں شامل ہونا چاہتا ہوں جو ساری دنیا گا رہی ہے۔ بہار آئے گی۔ بہار آئے گی ـــــ ....

میں اتنی مدت سے کیوں جل رہا ہوں؟ میں نیلا کی یاد کو اپنے سینے سے کیوں لگائے ہوئے ہوں؟ میں پاگل ہوں۔ میں کم ہمّت ہوں۔ آج میں نے سب ختم کر دیا ہے۔ آج یہ تنہائی مجھے نہیں ڈس رہی۔ آج میں بھی ایک عام آدمی کی طرح زندگی سے مسرّت اخذ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے بھی مسرّت چاہیئے۔ مجھے روح کا سکون چاہیئے۔ مجھے خوشی چاہیئے۔ مجھے گیت چاہئیں۔ مجھے بہاریں چاہئیں۔

مگر آج تو بہار کی آخری رات ہے۔

"نہیں" میں نے اپنے ہونٹ جکڑ لئے۔ "وہ آج بہار رخصت نہیں ہو گی۔ بلکہ میرے دامن سے لپٹ جائے گی۔ آج کے بعد میرے لئے ساری دنیا بہار ہی بہار بن جائے گی"۔

اور تب ناگاہ بہار کے رقص کا آغاز ہو گیا۔

میرے ذہن کا ہلکا ہلکا نشہ اونگھنے لگا۔

بہار۔ بہار۔ بہار۔ میرا دل چیخنے لگا۔ بہار۔ مگر بہار تو عورت کے دامن سے ہے۔ اور عورت ــــ؟ میرے لئے عورت کہاں ہے؟

میرا دماغ جیسے چیخ اُٹھا۔ عورت۔

میرا دل جیسے چیخ اُٹھا۔ عورت

میرے جسم کا رواں رواں چیخ اُٹھا۔ عورت۔

شراب کا ایک ایک قطرہ چیخ اُٹھا۔ عورت۔

مگر عورت کہاں تھی؟

میں نے ارد گرد دیکھا۔ اور تب یکبارگی روزی کی میز کے قریب آ گیا۔ روزی

جو خود شراب کا ایک گھونٹ تھی۔ روزی جو ہر مرد کی جیبیں ٹٹولا کرتی تھی۔ میں نے اپنی جیب ٹٹولی۔ اور اُس کے قریب بیٹھ گیا۔

میں اُس کے جسم کو دیکھنے لگا۔

عورت۔ یہی عورت۔ یہی عورت۔ میرے کان ان پکاروں سے پھٹ گئے۔ روزی —— روزی میرے لئے آنے والی بہار کا پہلا گیت تھی۔

میں نے اُسے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ سامنے رقص ہو رہا تھا۔ بہار کا آخری رقص۔ مگر میری زندگی بہار کا پہلا گیت گنگنائے جا رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا لوگ بہار کو الوداع کہہ رہے ہیں اور بہار میرے گلے لگ رہی ہے۔

میں اُسے لے کر باہر آ گیا۔ باہر نسبتاً اندھیرا تھا۔ پوری رات کا چاند آسمان میں ویسے ہی مسکرا رہا تھا۔ میں نے سوچا میری بغل میں بھی تو پوری رات کا چاند ہے۔

میں اُسے اندھیرے میں دور تک گھسیٹتا لے گیا۔

اور میرا دل اُچھلتا رہا۔ میں جیت گیا۔ میں نے اپنی تنہائی کو دھوکا دے دیا۔ میں آج خوش ہوں۔ بے حد خوش۔ آج زندگی میرے لئے جوان ہے۔ میرے ہر جانب گیت ہی گیت ہیں۔ اور روشنی ہے اور پھول ہیں۔ اور عورت کا غنائی جسم ہے میرے لئے کوئی غم نہیں۔ کوئی غم نہیں۔

روزی میرے سامنے کھڑی تھی۔

میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

میں نے اُس سے کہا وہ میرے قریب آ جائے۔ وہ میرے قریب آ گئی۔

دور لوگ گا رہے تھے۔ بہار آئے گی۔ بہار آئے گی۔

"ہشت" میں مسکرا اُٹھا۔ وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ بہار تو آچکی ہے۔ بہار تو میرے سامنے ہے۔ بہار تو مجھ سے لپٹنے کے لئے بے قرار ہے۔

میں نے روزی سے کہا "کیا تم ہی وہ بہار ہو جس کا لوگ انتظار کر رہے ہیں"۔

وہ ہنس پڑی۔ نیم اندھیرے میں اُس کے سفید دانت چمک اُٹھے۔ اور اُس کے ہونٹ پھیل سے گئے۔

میں ان ہونٹوں کو دیکھنے لگا۔

وہ مسکراتی رہی۔ یوں ہی مسکراتی رہی۔

میرے ذہن کی تمنائیں بیدار ہوتی گئیں۔

"تم ہی بہار ہو۔ تم ہی بہار ہو" میرا ذہن بار بار اُچھل رہا تھا۔ عورت بہار ہے بہار عورت ہے۔ عورت۔ بہار۔ بہار۔ عورت خیال گڈمڈ ہو رہے تھے۔

تب میں اُس کے قریب آگیا۔ بے حد قریب آگیا۔ میں نے اُس کے چہرے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اور اپنے چہرے کے بالکل نزدیک لے آیا۔

اب کوئی دوری نہ تھی۔ نہ چاند تھا۔ نہ نغمہ تھا۔ صرف دو ہونٹ تھے۔ بہار کے پھول کی طرح کے ہونٹ۔ ہونٹ جو سرخ تھے۔ جو ہلکے ہلکے کانپ رہے تھے۔ جو بے حد گداز تھے۔ جو نیم وا تھے۔ جو مجسّم دعوت تھے۔

میں ان ہونٹوں کو چوم لینے کے لئے جھکا۔

تب یک بارگی وہ ہونٹ میری نگاہوں کے سامنے پھیل سے گئے۔ اور بہت بڑے ہو گئے۔ ساری دنیا میری نگاہوں سے گم ہو گئی۔ صرف ہونٹ باقی رہ گئے۔ دو ہونٹ۔ بار بار بند ہو رہے تھے۔ بار بار کھل رہے تھے۔ بار بار کہہ رہے تھے "مجھے بدنام نہ کرو"۔

میرے جسم میں ایک روسی دوڑ گئی۔ میں کانپنے لگا۔ مجھے محسوس ہوا میرے اندر کوئی چیز ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ اور اس شکست پر میرا دل رونے لگا ہے جسک سسک کر رونے لگا ہے۔ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا ہے۔ اور مجھے سب کچھ بھول گیا ہے۔ "مجھے بدنام نہ کرو" ایک ہی آواز بار بار میرے کانوں سے ٹکرا رہی ہے۔ اور بہار کے سلونے نغمے اس ایک ہی آواز میں ڈوب گئے ہیں۔

میں نے اس کے جسم کو چھوڑ دیا۔ وہ متوحش نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ وہ میرے قریب کھڑی رہی۔

اور میرے لئے ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ ایک ہی گیت بار بار گونجتا رہا۔ "مجھے بدنام نہ کرو۔ مجھے بدنام نہ کرو"

میں اس نزدیکی کی تاب نہ لا سکا۔ میں چلّا اٹھا۔ "تم چلی جاؤ۔ تم چلی جاؤ۔ روزی" وہ مجھے دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہیں میرا تمسخر اڑاتی رہیں۔

میں گھاس پر اوندھا لیٹ کر رونے لگا۔

"تم جاؤ روزی ــــ تم جاؤ۔ میں تمھارے ہونٹ چوم کر تمھیں بدنام نہ کروں گا" دور لوگ ابھی تک گا رہے تھے۔ بہار آئے گی۔ بہار آئے گی۔

میں چیخ اٹھا۔ "جاؤ روزی۔ وہ بہار کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس کی سواگت کے گیت گا رہے ہیں۔ ان سے کہہ دو۔ بہار نہیں آئے گی۔ بہار کبھی نہیں آئے گی۔ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔

دیواریں

شاہد بھائی!

وہ بہار ہی کے تو دن تھے. جب تم پچھلی مرتبہ آئے تھے. جوان چاند حسین ہنگامے
شفاف آسمان. دل کی دھڑکنیں، ہونٹوں کے خاموش اشارے. سب ہی تو تم اپنے
ساتھ لائے تھے. کتنی مسکراہٹیں پوشیدہ تھیں اُن دنوں میں ——— مسرت کے
وہ جذبے، جو تم نے ہم لوگوں کو بخشے تھے. کیا ہم کبھی بھول سکیں گے؟ اُن جذبوں میں کیا
کچھ نہ تھا؟ ہماری خاموش. بے نور. بے آرزو زندگیوں کے لئے ایک نئی صبح طلوع ہوئی
تھی. اس سے پہلے کبھی زندگی کے کسی دور میں بھی تو ہم نے ایسا محسوس نہ کیا تھا. ایسے
خواب نہ دیکھے تھے، اتنی آرزوؤں کو اپنے دل میں نہ بسایا تھا.

تمہیں یاد ہے، تم نے ایک بار میرے بالوں کی لٹ جھلا کر کہا تھا "رشو، زندگی
ایک حسین مسکراہٹ ہے. ———" اور ہم نے تمہاری بات پر اعتبار کر لیا تھا
اور پھر مسکراہٹوں کو حاصل کرنے کے لئے ہم نے کیا کچھ نہیں کیا؟ تمہیں یاد ہیں نا وہ سارے
دن؟ وہ مسرت زا لمحے ....

مگر تم ہمارے ہونٹوں سے مسکراہٹیں چھین کر کیوں لے گئے؟ ہمارے ذہنوں
سے صبح کی روشنیوں کو کیوں دور کر دیا؟ ہماری زندگیوں سے آرزو، دل سے دھڑکن،
اور روح سے مسرت نوچ کر کیوں لے گئے؟ کیوں؟ کیوں؟ ہم نے ایسا کون سا

تصور کیا تھا ؟ تم نے تو پھر آنے کا وعدہ کیا تھا ۔ ہم تمہارے وعدے پر اعتبار کر کے تمہاری راہ تکتے رہے ۔ اب تو آنکھیں بھی تھک گئی ہیں ۔ تمہارے کتنے ہی وعدے جھوٹے نکلے ۔ تم نے عید کی چھٹیوں میں آنے کو کہا تھا نہ آئے ۔ بڑے دنوں کی چھٹیاں بھی یوں ہی گزر گئیں ۔ اب تو برداشت نہیں ہوتا ۔ طوفانوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے ۔ اندھیرے منڈلا رہے ہیں ۔ کیا ان اندھیروں کو دور کرنے نہ آؤ گے ؟

—— میں اپنی بات نہیں کر رہی ۔ میں شبنم کے بارے میں کہہ رہی ہوں ۔ شبنم جو میری آپا ہے ۔ جسے تم شبّو کہہ کر پکارتے ہو ۔ جسے تم نے ایک روز اپنا چاند کہا تھا ۔ جو ایک بے خبر معصوم ، دوشیزہ ہے ۔ اور جس کے دل میں تم نے محبت کے فتنے جگائے تھے ۔ وہ ننھے ننھے طوفان کھڑے کئے تھے جن سے ٹکراتے ٹکراتے اب وہ تھک گئی ہے ۔ تم نے اسے محبت کا جذبہ عطا کیا تھا ۔ اس جذبے کو وہ زندگی کا ماحصل سمجھ کر سینے سے لگائے بیٹھی ہے ۔ اور اس سے وہ جذبہ چھن رہا ہے ، اور وہ مجبور ہے ، بے بس ہے ۔ اس کے ارد گرد دیواریں ہیں ۔ وہ ان دیواروں میں گھری اپنے آپ کو لٹانے پر تیار بیٹھی ہے ......

شاہد بھائی ۔ تم نے اُس سے ایک روز کہا تھا "تم میری منزل ہو شبّو" پھر اب کیا ہو گیا ؟ کیا اب منزل کی آرزو نہیں رہی ؟ کیا اب شبّو کا حسن ویسا ہی اچھوتا ، اَن چھوا ، لازوال اور ابدی نہیں ؟ کیا اب شبو کے بال ویسے ہی لانبے اور خوب صورت نہیں ؟ کیا اب اس کی چال میں وہی قیامتیں نہیں جنھیں تم ایک نگاہ سے دیکھنے کے لئے ترسا کرتے تھے ؟ کیا اب اُس کی آنکھوں میں وہی حیا وہی گہرائی ، وہی تنویریں ، اور وہی محبت کے چراغ نہیں جنھیں تم گھنٹوں دیکھ دیکھ کر

نہیں تھکتے تھے ؟ سب کچھ تو وہی ہے شاہد بھائی ——— سب کچھ وہی ہے۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ صرف تم نہیں ہو۔ شاید تم وہ سب بھول گئے ہو ——— ؟

مگر کیا تم وہ دن بُھلا سکتے ہو ؟ وہ دن جب تم یہاں پہلے پہل آئے تھے۔ ——— یہاں، اس سامنے والے کمرے میں تمہارا سامان رکھا گیا تھا۔ گھر بھر میں ایک چہل پہل مچ گئی تھی۔ وہ بے رونقی، وہ جمود۔ جو اس گھر کی دیواروں پر ایک مدت سے طاری تھا۔ تم نے ایک ہی دن میں توڑ دیا تھا۔ اور میں اور شبّو، شبّو اور میں دونوں متحیر نگاہوں سے تمہاری جانب دیکھتے رہ گئے تھے۔ ایک مرد کے لاپرواہ، جوان، قہقہے زندگی میں پہلی مرتبہ ہمارے کانوں نے سنے تھے۔ اُن قہقہوں نے ——— ایک نئی، انوکھی، محبوب سی دھڑکن ہمارے دلوں میں پیدا کر دی تھی۔ وہ دھڑکن ——— ہاں شاہد بھائی وہ دھڑکن اس سے پہلے ہم نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ کبھی کبھی ——— اس لئے ہم چونک پڑے تھے۔ اور بار بار چھپ چھپ کر کوشش کر رہے تھے کہ ان دھڑکنوں کے خالق کو ایک نظر دیکھ تو لیں۔

پھر ہم نے تمہیں دیکھ لیا۔ تم امّی جان کے کمرے میں بیٹھے انہیں اپنے گھر والوں کے متعلق بتا رہے تھے۔ اور ہم دونوں، میں اور شبّو، اندرونی کمرے کے پردے کی آڑ سے باری باری تمہیں دیکھ رہی تھیں۔ مجھے یاد ہے شاید تمہارے کان چوڑیوں کی مترنم آوازوں کو بار بار سُن رہے تھے۔ اس لئے رہ رہ کر تمہاری نگاہیں اُس پردے کی جانب اُٹھ رہی تھیں۔

شبّو کا چہرہ اُس روز زرد ہو گیا تھا۔ اسے میں زردی ہی کہوں گی۔ اس سے مشابہ کوئی چیز تھی۔ میں اسے نام نہیں دے سکتی ——— عجیب سا رنگ تھا۔ جو تمہیں

دیکھ کر اُس کے چہرے پر چھا گیا تھا ۔ میں نے اس سے اس تبدیلی کے بارے میں کئی بار پوچھا تھا ۔ مگر وہ کچھ نہ بتا سکی تھی ۔ نہ جانے یہ کس قسم کی زردی تھی ۔ جو آپ ہی آپ تمھیں دیکھتے ہی پیدا ہو گئی تھی ۔ یہ زردی ، یہ پیلاہٹ ، ایک بار میں نے پھر دیکھی تھی ۔ اُس روز جب شبو تم سے پہلی مرتبہ تنہائی میں ملی تھی ——— میں نے ہی اس ملاقات کا انتظام کیا تھا ۔ جب تم نے اسے اپنے بالمقابل کھڑے دیکھا تھا ۔ تمھارا چہرہ بھی ان ہی آثار کا مظہر بن گیا تھا ۔

مگر تم شبو کے لئے ہر دم ترستے رہتے تھے ۔ وہ بہت کم باہر نکلتی تھی ۔ وہ ایک گڑیا کی طرح خاموش رہنے کی عادی تھی ۔ رسوئی ۔ کتابیں ۔ اور کاڑھنا ۔ اُس کا بہترین شغلہ ہونے کی وجہ سے وہ سارا سارا دن ایک ہی جگہ بیٹھ کر گزار دیتی ۔ اور تم ——— تم اُس کے پیکر کی ایک جھلک کیلئے گھنٹوں دوسری منزل کے اُن کمروں کی جانب دیکھتے رہتے تھے جہاں وہ کبھی کبھی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چلی جایا کرتی تھی ۔ اور اس کا رنگتا ہوا سایہ تمھاری تشفی کا سامان بنتا تھا ۔ یا کبھی دور سے سلیپر گھسٹنے کی دبی دبی آواز تمھارے کان سنتے تھے اور تم چونک کر بیٹھ جاتے تھے ۔ اور تمھارے جسم میں ایک عجیب سی لرزش ایک عجیب سا تناؤ پیدا ہوتا تھا ۔

مگر میں آپا کی طرح خاموش رہنے کی عادی نہیں ۔ تم جانتے ہو مجھ سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا ۔ میری رگ رگ میں شوخی ہے ۔ مجھے ان دیواروں سے نفرت ہے جو میرے ارد گرد مسلط ہیں ۔ اور میں ان کے درمیان محصور ہوں ۔ میں اُن دنوں اسکول جایا کرتی تھی دروازے پر ہی پردے والی اسکول کی گاڑی آرکتی تھی ۔ اور میں سکڑی سمٹی اس میں جا بیٹھتی تھی ۔ برقعہ کی دیوار ——— اسکول کی گاڑی کی دیوار ——— ہر طرف

دیواریں ہی دیواریں ——— مگر ان دیواروں سے اپنے آپ کو بچانا بھی تو ناممکن ہے!۔

اور تم ——— تم نے سب سے پہلے مجھے دیکھا تھا۔ ایک روز جب میں اسکول سے لوٹی تھی اور اپنے کمرے میں بستہ پھینک دینے کے بعد امی کی تلاش میں نیچے آئی تھی۔ کمرے کی ایک موڑ میں دفعتاً تم میرے سامنے آ گئے تھے۔ اور میں سر سے پیر تک کانپ اٹھی تھی۔

تم میرے سامنے کھڑے تھے۔ اور میں شرم سے پانی پانی ہو رہی تھی۔ میری نگاہیں زمین میں گڑ گئی تھیں۔ ہونٹ سوکھ گئے تھے۔ ذہن میں طوفان متلاطم ہو اٹھے تھے۔

اور تم ——— تم بھی بزدلوں کی طرح میرے سامنے کھڑے رہے تھے ———
بہت دیر تک ——— میں نے صرف ایک بار نگاہ اٹھا کر تمہارے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ میری طرح تم بھی اس اچانک حادثے سے پریشان تھے۔ تم بار بار ہونٹوں پر زبان پھیر رہے تھے۔ تمہاری آنکھوں سے خوف مترشح تھا۔ اور اس خوف سے ملی جلی ایک عجیب سی بیتابی، بے کلی اور مسرت جھانک رہی تھی۔

مگر وہ لمحہ بہت جلد بیت گیا۔ بہت جلد مجھے اپنے جنون کا احساس ہو گیا تھا۔ بہت جلد میرے ذہن میں بھی ایک خوف اٹھا تھا۔ اور ردِ عمل کے طور پر میں گھوم کر بے تحاشہ وہاں سے بھاگ آئی تھی۔ میرا خیال ہے تم کافی دیر تک وہیں کھڑے مجھے دیکھتے رہے ہو گے۔ ——— حیران و ششدر سے ——— میں خود وہاں سے آ کر بے دم سی اپنے بستر پر گر پڑی تھی۔ کافی دیر تک میری سانسیں ہانپتی رہی تھیں۔ سب کچھ

میری توقع کے بالکل خلاف اور اچانک ہوا تھا۔ پھر اس رات کافی دیر تک مجھے نیند نہ آئی تھی۔ جاگ جاگ کر گزاری ہوئی وہ رات جو ہلکے ہلکے سپنوں کے مابین بیت گئی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ وہ میری زندگی کی پہلی ایسی رات ہے جس میں میں نے کسی جوان مرد کے بارے میں سوچا۔ پہلی بار ایک ایسی لذت مجھے ملی جس سے میں آج تک ناآشنا تھی۔ اور میں نے طے کر لیا کہ جسم کی یہ سلگن، تمنا کی یہ بیقراری سپنوں کی یہ بیتابی۔ ماحول کی یہ تپش اور خوف زدہ، سہمے سہمے سے یہ جذبے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ حسین ہیں۔

میں نے سمجھا کہ یہی زندگی ہے!

یہ سب باتیں بے اختیاری ہی میں ہوئی تھیں۔ ان جانے ہی میں۔ آپ ہی آپ چند ایسے جذبے میرے دل میں پیدا ہو گئے تھے جن کے محبوب تم تھے مرکز تم تھے۔ میں بعد میں جان گئی تھی کہ میں غلطی پر تھی۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ان جذبوں سے زندگی میں پہلی مرتبہ تم ہی نے روشناس کرایا۔

پھر مجھے یاد ہے کہ کافی دنوں تک تم پریشان رہے تھے۔ کافی دنوں تک تم شبو کے سائے اور میرے وجود میں مناسبت تلاش کرتے رہے تھے۔ تمھارے خیالوں میں وہ پیکر بس گیا تھا۔ مگر تم نے کبھی اسے دیکھا نہ تھا۔ تم مجھ میں ہی وہ پیکر موں یہ سایہ جو مدتوں سے تم دیکھتے اور پوجتے آئے ہو میرا ہے۔ میں اب آہستہ آہستہ تمھارے قریب آنے لگی تھی۔ سکول سے آتے یا جاتے میں تم میرے جسم یا میرے چہرے کی ایک جھلک دیکھ پاتے تھے۔ کبھی کبھی میں یوں بے دھڑک سی تمھارے سامنے سے گزر جاتی تھی۔ میں نے کہا نا مجھے ارد گرد کی دیواروں سے نفرت ہے

میں سمجھتی تھی میں تمھارے سامنے آکر ان دیواروں کی زد سے باہر ہو جاتی ہوں یہ دیواریں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ میرا دلِ دیوانہ مسرت سے ناچتا۔ میں نے دنیا کی بندشوں کو توڑ دیا۔ میں ایک مرد کے سامنے سے گزرتی ہوں۔ اس کے دل کی دھڑکنوں کو بڑھاتی ہوں۔ کوئی میرے لئے تڑپتا ہے۔ میرے ایک ایک جلوے کے لئے بے تاب رہتا ہے۔ میرا دل اُن دنوں فتح کے نشے سے معمور رہتا۔ سچ کہتی ہوں شاہد! میرے لئے یہی دنیا کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ میرے اندر کی باغی عورت اپنے آپ کو دنیا میں سب سے بڑا فاتح سمجھتی۔

مگر ایک دن یہ رنگ محل ٹوٹ گئے۔ ایک دن مجھے پتہ چل گیا کہ تم میرے لئے نہیں شبّو کے لئے بے قرار رہتے ہو۔ —— ایک دن تمھیں پتہ چل گیا کہ میں میں اور وہ سایہ جو تمھارے ذہن میں گھر کر چکا ہے۔ الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ تمھارے وہ لفظ مجھے بھولے نہیں۔

"تم شبّو ہو؟"

"نہیں! میں رشیدہ ہوں"

"اوہ! میں سمجھا تھا تم شبّو ہو!"

اُس روز قیامت آگئی تھی۔ میں تڑپ اُٹھی تھی۔ میں بجلی بن کر تمھارے صبر و قرار پر گر پڑنا چاہتی تھی۔ میں ایک طوفان بن کر تمھیں اپنے ساتھ بہا لیجانا چاہتی چاہتی تھی۔ مگر بے بس تھی۔ ان ہی دیواروں نے مجھے روک دیا تھا۔ اُفوہ! وہ نفرت انگیز دیواریں —— ....

میں ہار گئی تھی۔ اور یہ ہار بے حد تلخ تھی۔ بے حد شدید۔ بے حد تکلیف دہ....

..... اور تب یک بارگی میں ایک چراغ کی طرح بجھ گئی — ....

مگر میری ہار تمھاری سب سے بڑی جیت بن گئی تھی۔ تم نے خوشبو کو پالیا تھا — خوشبو آہستہ آہستہ تمھارے قریب آرہی تھی۔ خوشبو کے اندر بھی میں نے وہی بے قراریاں دیکھیں، وہی اضطراری کیفیتیں، وہی خالی الذہنی — گھنٹوں اپنے آپ میں گم —

لیکن میں بتا چکی ہوں کہ وہ ایک خاموش گڑیا تھی۔ گھنٹوں رسوئی میں آگ کے قریب بیٹھی آگ کے شعلوں کو دیکھتی رہتی تھی۔ اس کی زبان چپ تھی۔ اس کا چہرہ خاموش تھا۔ اُس کی آنکھیں حسرت آلود تھیں۔ وہ اپنی غماز آپ تھی۔ اس کے دل کا راز کسی پر عیاں نہ ہوتا تھا۔ وہ چپکے چپکے اپنے آپ میں ڈوبی رہتی۔ اُس نے اپنی زبان سے کبھی ایک لفظ تک نہ چاہا۔ اپنے آپ ہی جلتے رہنا اُسکی فطرت تھی۔ وہ ایک ایسی دوشیزہ تھی جس کے ہونٹوں پر کبھی تڑپ کا جذبہ نہ دیکھا گیا۔ وہ ایک شمع کی طرح جلتی رہتی تھی۔ وہ عزت اور لاج کی دیواروں میں محبوس رہنے کی عادی تھی۔

پھر وہی دیواریں — شاید ان دیواروں نے ہم لڑکیوں کو کہیں کا نہیں رکھا — دیواریں! یہ چھوٹی کچی ٹیڑھی دیواریں۔ یہ خیالی دیواریں۔ جن کے اندر ہم لڑکیاں گھٹ گھٹ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ اور جذبات کا اظہار نہیں کر سکتیں۔ حیا اور شرم کی دیواریں۔ خاندان کی دیواریں۔ جھوٹی آن اور فرسودہ رسومات کی دیواریں سماج اور دنیا کی دیواریں — ہر قدم پر دیواریں ہی دیواریں — یہ دیواریں ہماری سب سے بڑی کمزوریاں ہیں۔ ان سے ٹکراتے ٹکراتے ہم تھک جاتی ہیں۔
— ایک سے باہر نکلتی ہیں تو دوسری سامنے آجاتی ہے۔ دوسری پار کرتی ہیں

تو تیسری کا مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ بالآخر ہمیں ہار ماننا ہوتی ہے۔ عورت ہار ہی کا تو نام ہے!

اور تم ـــــ تم اتنے سارے مردان دیواروں کے اندر ہمیں بند کر کے خوش ہوتے ہو۔ میں نے تمہارا نام خصوصاً لیا۔ کیونکہ تم جانتے ہو شبنم بے زبان ہے۔ شبنم مجسمے کی طرح خاموش ہے۔ شبنم مرجائے گی لیکن زبان تک نہ ہلائے گی۔ شبنم تمہاری بے وفائی کی شکایت کبھی نہ کرے گی۔ شبنم کبھی نہ کہے گی کہ تم نے اُسے دھوکا دیا۔ وہ اتنے سارے وعدے، وہ پیمان، وہ زندگی کی منزلیں، وہ باتیں کہاں ہوئیں؟ تمہیں یاد ہے میں ہی ایک روز شبنم کو تمہارے سامنے لائی تھی۔ شبنم تو کبھی اس بات کی ہمت نہ کرتی۔ وہ تو شرم کی دیواروں میں محبوس تھی۔ اُس روز تم نے اسے یوں دیکھا تھا جیسے کوئی مقدس چیز ناگاہ تمہارے سامنے آگئی ہو۔ اور تمہارا سر جھک گیا ـــــ اس روز ـــــ اس روز کے بعد تم نے شبنم کو اپنی زندگی سمجھنے کا وعدہ کیا تھا!

اور یہ وعدہ کر کے تم چلے گئے تھے۔ شبنم تمہارے وعدہ پر اعتبار کئے بیٹھی رہی۔ ـــــ شبنم نے اپنی مسکراہٹیں تمہارے لئے وقف کر دیں۔ اُس نے ان مسکراہٹوں کا ایک ذرّہ بھی کسی اور کو نہ دیا۔ ـــــ کتنی بخیل تھی وہ اس معاملہ میں ـــــ!

یہ میں اس لئے کہہ رہی ہوں کہ تمہارے جانے کے بعد ہی ہمارے ہاں اختر آگیا تھا۔ اختر کو تم جانتے ہی ہو گے وہ آفتاب چچا کا لڑکا ـــــ لمبا تڑنگا۔ یونان کے دیوتاؤں کا سا شکیل۔ چوڑا چکلا سینہ۔ ماتھے پر بکھرے بال، خوب صورت آنکھیں ـــــ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار آیا تھا۔ مگر اس بار ـــــ اس بار وہ

ایک خاص مقصد لے کر آیا تھا۔

اور جانتے ہو وہ مقصد کیا تھا؟ تمہیں بتا دوں؟ وہ مقصد تھا شبنم کو حاصل کرنا ۔۔۔ ہاں تمہاری شبنم کو ۔۔۔ .... کیوں چونک کیوں پڑے؟ وہ آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی ہوسناکی لے کر اُس کی جانب لپکا تھا۔

مگر شبنم ۔۔۔! شبنم کا سایہ بھی تو وہ نہ دیکھ سکا۔ شبنم نے کبھی کسی حال میں بھی اُس کا چہرہ تک دیکھنا گوارا نہ کیا۔

اور تم جانتے ہو اختر کیسا انسان ہے۔ وہ اپنی شکست کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ ۔۔۔ اُس نے شبنم کا پیچھا چھوڑنا اپنی توہین سمجھا۔

اُن ہی دنوں اُس کے راستے میں میں آگئی۔ مجھے ان سب باتوں کا پتہ نہ تھا میں نے یوں ہی ایک روز اُسے دیکھا اور میرے ذہن میں وہ تمام جذبے جاگ اُٹھے جو تم نے پیدا کئے تھے۔ اور تم ہی نے جنھیں موت کی آغوش بخشی تھی ۔۔۔ مگر اختر کے آجانے سے ان تمام جذبوں نے ایک بار پھر جنم لیا۔ آپ ہی آپ ۔۔۔ مجھے پتہ بھی نہ چلا کہ میں کیا کر رہی ہوں ۔۔۔ اور ایک روز جب میری آنکھ کھلی میں نے محسوس کیا میں اختر سے محبت کرنے لگی ہوں۔ ۔۔۔ بے انتہا محبت ۔۔۔ شدید اور والہانہ محبت۔

اور یہ دن کیسے گزرے۔ میں تمہیں کیسے بتاؤں ۔۔۔ اختر نے میری محبت۔ میری بے چارگی۔ اور میری دوشیزگی کا خوب فائدہ اُٹھایا۔ اختر نے مجھے نئے انوکھے رنگ محل دکھائے ۔۔۔ ایسے خواب جو اس سے پہلے میں نے کبھی نہ دیکھے تھے۔ اور ان خوابوں، اُن وعدوں کے سہارے میں لٹتی گئی، میں ہارتی گئی۔

——— اپنے آپ کو گہرے غاروں میں ڈھکیلتی گئی۔

مرد کتنا فریبی ہوتا ہے ——— کتنا ریاکار۔ میں نے اختر کو دیوتا سمجھا اُس سے اپنی ساری قوتوں سے محبّت کی۔ اس میں ہی اپنی زندگی کے تمام خوابوں کی تعبیر کو تلاش کیا۔ اور وہ مجھے آغوش میں لئے یہ سارا عرصہ کسی اور سے محبت کرتا رہا ——— کسی اور کو حاصل کرنے کے منصوبے باندھتا رہا۔ کسی اور کی بہاروں میں ٹہلتا رہا۔ اور میں سمجھی میں دنیا کی سب سے خوش نصیب عورت ہوں۔ محبوب میرا ہے۔ خوشیاں میری ہیں۔ مسرتیں میری ہیں ——— مگر میرا کچھ نہ تھا ——— اور جو کچھ پہلے تھا وہ اب بھی باقی نہ تھا۔

یہ سب کیوں ہوا؟ جانتے ہو؟ میں تو کہتی ہوں۔ وہی دیواریں میرے لٹنے کا باعث بنیں۔ آج اگر یہ دیواریں نہ ہوتیں تو کیا ایک ریاکار اور بے وفا مرد اس آسانی سے مجھے لوٹ سکتا؟ اگر میں نے ذرا دنیا دیکھی ہوتی تو کیا میں ایک بے خبر انجان لڑکی کی طرح ایک جھوٹے وعدے پر اپنا آپ قربان کرنے پر آمادہ ہوجاتی؟ مگر میں نے تو کچھ نہ دیکھا تھا۔ مجھے تو بہت کچھ دیکھنے کی آرزو تھی۔ اور ان دیواروں نے مجھے کچھ نہ دیکھنے دیا تھا۔ ——— آہ ——— شاہد۔ ان دیواروں سے مجھے کتنی لاانتہا نفرت ہوگئی ہے!

شاہد ——— اب اختر چلا گیا ہے۔ اسے گئے ہوئے بہت دن ہوگئے ہیں ——— میری آنکھوں میں ناکامی اور بربادی کے آنسو ہیں۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اختر کی منزل شبنم تھی۔ اور میں یوں ہی پس گئی۔ پھر میں نے سوچا مجھے خوش ہونا چاہیئے ——— میں نے تبسّو کو اختر کے جال سے بچالیا ہے۔ اب محبّت بھرے

دل کو محبّت کے لُٹ جانے سے بچالیا ہے۔

مگر کیا ایسا ہوا؟ ایسا ہو سکا؟ ـــــ نہیں شاہد نہیں ـــــ ایسا ہونے کے بجائے وہ ہونے جارہا ہے۔ جس نے ہم سب کو طوفان کی زد میں لے لیا ہے۔ جانتے ہو یہاں کیا ہونے جارہا ہے؟ تم نہیں جانتے؟ یہاں شبنم کے بیاہ کی تیاریاں ہورہی ہیں ـــــ شبنم کے بیاہ کی ـــــ تمہاری شبنو کے بیاہ کی ـــــ اختر کے ساتھ ـــــ اختر جو میرا ہے۔ جس نے میری جوانی، میرے ارمان اور میری کائنات لوٹی۔ اختر جو ایک بے وفا مرد ہے۔ جس نے جھوٹی دیوارول کے سہارے ایک عورت کی دوشیزگی تار تار کر ڈالی۔ اب ان ہی دیواروں کا سہارا لے کر ایک دوسری عورت کو لوٹنے جارہا ہے۔ اس نے گھر جاتے ہی بیاہ کا پیغام بھجوا دیا ہے۔ اس کا پیغام یہاں منظور ہو گیا ہے۔ ـــــ اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

ہم بے بس ہیں۔ ہم رو رہے ہیں، ہماری آنکھوں میں آنسو ہیں، اور زبانیں گنگ ہیں۔

مگر شاہد! تمہاری زبان تو گنگ نہیں ـــــ تم تو ایک مرد ہو ـــــ تمہارے تو اردگرد یہ دیواریں نہیں ہیں۔ خدا کے لئے شاہد اپنی شبنو کو لٹنے سے بچالو۔ ـــــ مجھ سے اس کی خاموش سسکیاں نہیں دیکھی جاتیں ـــــ اس کی آنکھوں کی ویرانگی میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ وہ دیوانہ وار گھنٹوں خلا میں دیکھتی رہتی ہے ـــــ اُس کے ہونٹوں پر اب بھی تمہارے بھولے ہوئے وعدے کا ہلکا سا پرتو ہے ـــــ اُس کی آنکھیں اب بھی کبھی کبھی تمہارے

انتظار میں دروازے کی جانب اُٹھ جاتی ہیں۔ وہ اب بھی تمہاری ہے —
اُسے بچا لو شاہد —— ان دیواروں میں وہ پِس جائے گی ——
مجبوری کی دیواریں اُسے ڈس لیں گی —— اس سے وہ مسکراہٹ چھن
جائے گی جو اُس کے ہونٹوں کو تابناکی اور تازگی دیتی ہے۔ پھر ساری عمر
اُس کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ نہ آسکے گی۔ اس مسکراہٹ کو زمین کے
لاکھوں پریشان سینوں کی طرح تاریکی میں گم ہو جانے سے بچا لو —— خدا کے
لئے شاہد ان دیواروں کو گرا دو —— ان جھوٹی دیواروں کو چند ایسی
ٹھوکریں عطا کرو۔ جو یہ ہمیشہ کے لئے گر جائیں۔ یہ مرد کی بنائی ہوئی دیواریں عورت
کو مجبور اور گنگ کر دیتی ہیں۔ —— یہ دیواریں ناقابل برداشت ہیں۔
—— تمہاری ذرا سی ہمت سے یہ دیواریں ہٹ سکتی ہیں۔ —— تم
شبو کو اختر کے چنگل سے بچا سکتے ہو۔ خدا کے لئے دیر نہ کرو۔

اور میں —— میں اختر کو پا سکی یا نہ پا سکی میرے لئے برابر
ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ اختر اگر مجھے مل سکے تو میں اپنے خوابوں کو لوٹا سکتی
ہوں۔ وہ مجھے بے حد عزیز ہے۔ مجھے اس سے محبت ہے۔ بے پناہ محبت ہے!
کاش تم میری اور شبو کی کھوئی ہوئی محبت کا راستہ تلاش کر سکو ——

"رشو"

کسک

کوشش کر کے وہ ایک بار پھر اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آئی۔

وہ اس کی مسکراہٹ کو دیکھتا رہا۔ پھر منھ پھیر کر لیٹ گیا۔ چند لمحے لیٹے رہنے کے بعد اُٹھ کر دریچے کے پاس چلا گیا۔ سگرٹ کا ایک طویل کش لینے کے بعد واپس آ کر اُس کے بستر کے قریب پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔

اور اُسے محسوس ہوا کہ اُس کی انگڑائی بیچ ہی میں کہیں ٹوٹ گئی ہے

وہ بہت دیر سے اُسے خوش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر اب تو اُس کا سارا جسم چور چور ہو چکا تھا۔ خوب صورت لباس ... عورت۔ شباب۔ رات۔ تنہائی .... سب کچھ تو تھا مگر نہ جانے اس مرد کے دل میں کیا تھا؟ وہ کیا چاہتا تھا؟ اُس نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ اور سر پلنگ کے سرہانے جڑے شیشے پر ٹیک دیا۔ آہ! آج وہ کس قدر تھک گئی ہے! نیند اُس کی پلکوں کے کناروں پر لرز رہی ہے۔ کاش وہ اس طرح آرام سے سو سکتی — ....

مگر دوسرے ہی لمحے اُسے اپنی آنکھیں کھول دینا پڑیں۔ وہ مرد اُس کی جانب جھک آیا تھا۔ "سنتی ہو! اسی مسکراہٹ کے لئے تو میں ترس گیا ہوں۔ وہ مسکراہٹ تو اب مجھے کہیں نہیں ملتی۔"

وہ چڑ گئی: "نہ جانے تم کیسی مسکراہٹ چاہتے ہو؟"

"وہ مسکراہٹ۔" اس کی آنکھیں چمک اٹھیں وہ مسکراہٹ سمٹی سمائی تھی۔ لجائی، جھجکی ہوئی تھی۔ جو آپ ہی آپ اس کے ہونٹوں پر آ ابھرتی تھی۔ بار بار۔ جو کہیں باہر آنے کے بجائے وہیں پر جنم لیتی تھی۔ چند لمحے لرزتی رہتی تھی اور پھر معدوم ہو جاتی تھی۔ اس مسکراہٹ میں حیا بھی تھی۔ شوخی بھی۔ اجتناب بھی تھا اقرار بھی۔ اور ان سب کے ساتھ ایک ایسی لازوال خوب صورتی تھی جو دنیا کی کسی اور شے میں ناپید تھی — ...."

وہ صوفے میں پچھلی طرف جھک گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں وہ سوچنے لگی شاید وہ خیال ہی خیال میں اس مسکراہٹ کو دیکھ رہا ہے۔

اس کے اندر بغاوت کی ایک لہر سی جاگ اٹھی۔ مگر وہ کیا کرے؟ وہ اس کی گم شدہ مسکراہٹوں کے لئے کیوں ترسے؟ یہ ٹھیک ہے کہ آج رات وہ اس کی لونڈی ہے۔ اس نے اس کے جسم۔ اس کی جوانی اور اس کے حسن کے دام ادا کئے ہیں۔ آج رات اسے اس کے اشاروں پر ناچنا ہوگا۔ مگر وہ اپنی طرف سے کتنی انتہائی کوشش کر چکی ہے کہ اسے اس کے داموں کا پورا عوضانہ دے سکے اس نے اس کے لئے راحت کے پورے سامان مہیا کر دئے ہیں۔ زہر شکن انگڑائیاں لے کر وہ بار بار اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی سعی کر چکی ہے۔ نیند کا بہانہ کر کے ناز و ادا سے، عشووں سے اسے راغب کرنے کی کوشش کر چکی ہے۔ مگر نہ جانے وہ کیا چاہتا ہے؟ کتنا عجیب ہے اس کا یہ گاہک بھی — !

اور اب تو وہ اس سے اکتا چکی ہے، جب خود اسے اپنے دئے ہوئے روپے کا احساس نہیں تو وہ کیا کرے؟ نہ جانے کتنی رات بیت چکی ہے!

اُفوہ! اب تو بہت دیر ہو گئی۔ اب تو اُس سے برداشت نہیں ہوتا۔ اب اگر پھر وہ پاگل پن میں کہہ دے کہ اپنے بال کھول دے۔ اور بالوں کو کھولنے کے بعد ٹھنڈی آہ بھر کر کہے "مگر اُس کے بال تمہارے بالوں سے بھی لمبے تھے۔ جب وہ بال لہراتی تھی تو وہ اُس کے کولھے چومنے لگتے تھے" اور پھر اُس کے پاس بیٹھ کر اُس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگے۔ اور کہے "ایسے ہی کئی بار میں خود اُس کے بال سنوارا کرتا تھا۔ اس کی چوٹیاں سنوارا کرتا تھا" اور بال بنانے کے بعد کئی کئی زاویوں سے اُنہیں دیکھے۔ پھر کبھی کوئی لٹ پھیلا دے۔ اُسے خم دے۔ پھر سنوارے۔ اُفوہ! کتنی طویل اُکتا دینے والی حماقت آلود باتیں.........

اور بہت دیر سے وہ اس کی باتیں سنتی آئی ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر پہلے پہل جو اُسے اُس پر رحم آیا تھا۔ اب وہ آہستہ آہستہ نفرت میں بدلتا جا رہا ہے۔ یہ مرد کتنا بے وقوف ہے؟ بس اب تو یہی ایک خیال اُس کے ذہن میں جم گیا ہے۔ بھلا جو مسکراہٹ گم ہو گئی اُسے واپس کیسے لایا جا سکتا ہے ......

وہ کہہ رہا تھا "میری بیوی کے پاس صرف یہ مسکراہٹ ہی نہیں تھی۔ اور بھی بہت سی خوبصورت چیزیں تھیں۔ مثلاً اس کے بال جو کٹے کالے، ہلکے سنہری رنگ کے تھے۔ اور اُس کی آنکھیں جو رُکی ہوئی موج کی طرح، یا ایک کنول کی طرح یا ایک جھیل کی طرح تھیں۔ اور اس کے اوپر کے ہونٹ کا خم جو دُوج کے چاند کی طرح تھا۔ اور اُس کے رخساروں کی گولائی اور اُس کی اونچی اُٹھی گردن اور اُس کے جسم کے لاانتہا زاویے۔ اور اُس کی چال اور اُس کی باتوں کی ہلکی ہلکی گھنٹیاں۔ اور بھی بہت کچھ۔ بہت سے ایسے جذبے جنھیں دیکھنے کے بعد

محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ یا یوں کہا جائے کہ ایسے تاثرات جو اُس کے گزر جانے کے بعد بھی دیر تک فضا میں محلول رہتے تھے۔ اور اُن سے پیچھا نہیں چھڑایا جاسکتا تھا۔ ــــــــــ سُن رہی ہو؟"

"ہاں"! ایک مری ہوئی آواز۔ اس کا جواب۔ ایک اُکتاہٹ

"تمہیں شاید نیند آرہی ہے" وہ کہہ رہا تھا "مگر میں تمہیں سونے نہیں دوں گا۔۔ میں مدتوں سے اُس کی یادوں کے اندھیروں میں گھرا ہوں۔ تم روشنی کی پہلی کرن ہو۔ بھگوان کے لئے مجھ سے یہ سہارا نہ چھینو ــــــــ"

"روشنی۔ روشنی۔ روشنی ــــــــ" وہ چیخ اُٹھی ــــــــ

"آخر تم چاہتے کیا ہو"؟

وہ ہنس پڑا۔ "تمھیں نہیں پتہ چلا۔ میں چاہتا کیا ہوں؟ میں اُسے یاد کرنا چاہتا ہوں اور بس ــــــــ میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ میں اُس کی یاد کے سہارے زندہ رہوں گا۔ مگر میرا دل بھر آیا ہے۔ مدتوں سے کسی نے میری بات نہیں سُنی۔ تم بھی اُس کی طرح کی عورت ہو۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم میری باتیں سنو ــــــــ عورت کی گود میں مجھے بے حد سکون ملتا ہے مگر یہ سکون مجھے کبھی نہیں ملا۔ بھگوان کے لئے مجھے یہ سکون دے دو۔"

اُس نے اپنا گھومتا سر پلنگ سے ٹیک لیا۔ اُفوہ! وہ کیا کرے؟ اس خبطی انسان سے کیسے اپنی جان بچائے؟ نہ جانے اس کے آگے وہ اتنی کمزور سی کیوں ہوتی جاتی ہے؟ کیوں رحم کی لہریں اُس کے دل و دماغ میں دوڑتی جاتی ہیں؟ نہ جانے اس مرد کی چھوٹی چھوٹی سی آنکھوں میں کون سا ایسا درد

پوشیدہ ہے کہ اُسے اُس پر بے انتہا ترس آرہا ہے؟ مگر یہ بے ربط باتیں آخر ان کا اختتام کہاں ہوگا؟ ——

اُس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ بدستور سگرٹ پی رہا تھا۔ اُس نے آہستہ سے کہا "تم نے کہا تھا کہ تم شاعر ہو؟"

"ہاں!"

"تب میں کوئی گیت گاؤں؟"

"گیت —؟ نہیں! گیت نہیں —— گیتوں سے تو مجھے اپنی تنہائی کا احساس بری طرح ستانے لگتا ہے۔ تم گیتوں کو رہنے دو۔ میں نے اپنے سارے گیتوں کا گلا گھونٹ دیا ہے —— جب وہ مر گئی تھی۔ گیت بھی مر گئے تھے۔ اور میرے دل کی وہ خوب صورتی بھی، جو ان گیتوں کو جنم دیتی تھی۔ ....."

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ کہنے لگی "تم بہت عجیب آدمی ہو —— ایسی رات لوگ میرے دل کے تھرکنے پر مرمٹنے کے لئے آتے ہیں۔ اور آج کی رات جب کہ اتنی خوب صورتی ہے، جب کہ خود میرا دل چاہ رہا ہے۔ میں ناچوں تم نے مجھے روک دیا —— ..... گھٹن۔"

"اگر تمھارا جی چاہتا ہے تو ناچو —— صرف یہ بتیاں جلا دو۔ اتنے اندھیرے میں جب تم ناچوگی تو لمبے لہراتے سائے میرے دل میں عجیب وحشت پیدا کریں گے۔"

"اب میں نہیں ناچوں گی۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔

وہ اُس کی بیوی کے بارے میں سوچنے لگی۔ نہ جانے کون ہوگی؟ ——

کیسی ہوگی؟ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ہوگی وہ انتہا درجہ حسین ——
جب ہی تو اُس کے ذہن سے اُس کی یاد کے تاثرات نہیں مٹتے ..... اس سے
کس درجہ محبت کرتی ہوگی؟ ... ان دو گھنٹوں کے مختصر سے عرصہ میں جب سے وہ
یہاں آیا ہے۔ اُس نے اسے اُس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس
وقت سے جب اُس کے خوب صورت ہاتھوں میں مہندی لگی تھی۔ اس کی مانگ
میں سیندور بھر اگیا تھا۔ اور مومی پیروں میں جھانجھیں باندھ دی گئی تھیں۔ اُس
وقت تک جب وہ مری تھی۔ اور یہ تمام باتیں سوچنے کے بعد وہ یہ سوچنے پر مجبور
ہو گئی تھی کہ اُس کی بیوی ایک باکمال عورت تھی!

مگر وہ کیا کرے اُسے ان باتوں سے کیا مطلب؟ وہ کیوں اتنی دیر
سے اُس کی بے ہنگم، بے جوڑ، بے کیف۔ باتوں کو سُن رہی ہے۔ اور اس
رات کو ضائع کر رہی ہے؟ یہ مرد کتنا حسین ہے؟ ایسے مرد اُس کے پاس ہر روز
کہاں آتے ہیں؟ ان مردوں کے مقابلے میں جو بدصورت چہروں، اور جنس کے
ناآسودہ جذبوں کو لے کر اُس کے پاس آتے ہیں۔ یہ مرد کتنا بہتر ہے؟ آج کی
رات جیسے اُسے محسوس ہو رہا ہے وہ جہنم کے اُن شعلوں سے جن میں وہ روز جلتی
ہے، اپنا دامن بچا کر کہیں دوسری جگہ آگئی ہے۔ جہاں اُس کا جی چاہ رہا ہے
کہ چند لمحے آرام سے لیٹ جائے۔ اپنی مدتوں سے تھکی پلکیں بند کرے اور اس
مرد کی گود میں سر رکھ کر نیند کی آغوش میں ڈھلک جائے اور میٹھے سہانے
خواب دیکھے اور ان آرزوؤں کو پالے جو اُسے کبھی نہیں ملیں اور جب اس کی
آنکھ کھلے تو وہ تصور کرنے لگے کہ یہی جنت ہے۔ کہ یہی زندگی ہے۔ مسرت ہے۔

سکھ ہے ——— یہ زندگی روزمرّہ کی زندگی سے کتنی مختلف ہے ؟ —
کاش یہ لمحہ اُسے میسر آسکتا !

مگر یہ مرد ——— .... یہ مرد جو اُس کے اتنے قریب ہے اور
اتنی دور ہے —— یہ مرد ——— ....

مرد کہہ رہا تھا —— "میری بیوی ——— ...."

اس کے اندر کی پیاسی عورت اُسے پھُسلانے لگی ——" سنو —
یہ اتنی سہانی رات —— .... اتنی تنہا۔ خوب صورت اور مکمل رات۔ تم اپنی
مری ہوئی بیوی کے سوائے کچھ اور نہیں سوچ سکتے ؟ دیکھو! چاند وہاں بھی ہے۔
اس دریچہ کے باہر — یہاں بھی — اس پلنگ پر — تم نے سب سے پہلے مجھے
دیکھ کر یہی کہا تھا کہ میں چاند کی طرح حسین ہوں — یہی تھے نا تمہارے لفظ
— پھر اس چاند کی موجودگی میں، آسمان کے اس چاند کی موجودگی میں۔
حسن و شباب کے اس ماحول میں جب کہ رات بھی دم بخود ہے۔ تمہیں اور کیا
چاہیئے — کیا چاہیئے ؟"

اُس نے سگرٹ پھینک دیا اور اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ اور
سسکنے لگا " مجھے سکون چاہیے۔ مجھے سکون چاہیئے۔ اُس کے مرنے کے بعد
مجھے کہیں بھی سکون نہیں ملا آہ ——— میں اُس سے کتنی بے انتہا
محبت کرتا تھا ——"

وہ بستر سے اُتر کر اُس کے قریب آگئی۔ اُس کے سر پر آہستہ آہستہ ہاتھ
پھیرتے ہوئے کہنے لگی — "اگر میں بھی تم سے محبت کرنے لگوں — تو — ؟"

"تم؟" اُس نے چونک سر اُٹھایا۔

"ہاں! میں ـــــ میں بھی عورت ہوں۔ مجسم شاعری ہوں۔ میرے جسم کے ساتھ بھی وہی لطافتیں پوشیدہ ہیں۔ تم نے کہا تھا نا کہ تمھاری بیوی بےحد حسین تھی۔ آنکھیں کھول کر دیکھو، میں بھی تو کم حسین نہیں ہوں۔ میرے بھی تو ایک ایک اشارے پر کائنات بل کھا جاتی ہے۔ ـــــــ اُٹھو! ـــــــ میرے قریب آؤ ـــــ تمہیں ایک عورت کی شفیق گود کی ضرورت ہے۔ آؤ میں تمھیں سُلاتی ہوں ـــــ آؤ ـــ!"

وہ اُس کے قریب آ گیا۔

"سنو" وہ کہنے لگی ـــــــ "تم اُس کو بھول نہیں سکتے؟"

"نہیں" ـــــــــ اس کی آواز لرزنے لگی ـــــــ "میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ وہ میری زندگی تھی اور جب وہ نہیں تو مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں ایک بے رنگ و بو پھول ہوں۔ یا ایک ایسا درخت جس میں کوئی پھل نہیں ـــــــ" وہ چپ ہو گیا۔

چند لمحے خاموشی رہی ـــــ وہ سوچنے لگی واقعی وہ کتنی حسین اور باوفا ہو گی۔ جس کے چھوڑے ہوئے نقش اس قدر اَمٹ ہیں۔ اس کے حسن میں کتنے غمزے ہوں گے۔ مگر ایک بیوی میں صرف حسین ہونا ہی تو کافی نہیں ہوتا۔ اس میں اور بھی بے انتہا خوبیاں ہونگی۔ تب ہی تو وہ اسے بھول نہیں سکتا ....

اور پھر وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "تم مجھے معاف کرنا گر مجھے کچھ جنون سا ہے

کیا کروں۔ دل ہی ایسا ہے۔ جتنا اس کے بارے میں کسی کو بتاتا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں نے اُس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ اور بہت زیادہ بتانا چاہیئے۔ تاکہ سننے والا محسوس کرے کہ وہ کیسی تھی ..... ـــــــ"

"مگر تم تو اُس کے بارے میں مجھے اتنا بتا چکے ہو کہ میں سوچتی ہوں کہ پریاں بھی اتنی کیا خوب صورت ہوں گی ـــــــ"

پھر خاموشی چھا گئی دونوں چھت کی جانب موںہہ کئے لیٹے رہے۔ دونوں کے ہاتھ اپنے اپنے سینوں پر رکھے تھے۔ دل دھڑک رہے تھے فضا میں ایک عجیب سا سناٹا تھا۔ روشنی مدھم اندھیروں میں مبدّل ہو چکی تھی۔

بہت دیر ہو گئی۔ اُس نے پوچھا "کیا سوچ رہے ہو"

"کچھ نہیں۔ سوچ رہا ہوں۔ مجھے واقعی اُسے بھول جانا چاہیئے"

"ایک بات پوچھوں"؟

"پوچھو ـــــــ"

"تم کتنا عرصہ اس کے ساتھ رہے"؟

"دو برس ـــــــ ....."

"پھر وہ مر گئی کیسے؟ کیا بیمار ہو گئی تھی"؟

خاموشی چھا گئی ـــــــ ایک ہولناک خاموشی ـــــــ اُس کا دل زور زور سے اُچھلتا رہا۔ پھر وہ جیسے بہت دور کہیں سے کہنے لگا۔ "اسے ماں بننے کی بے حد خواہش تھی۔ دن رات کسی ننھے سے بچے کے سپنے دیکھا کرتی تھی۔ ہماری

زندگی سورگ کی طرح گزر رہی تھی۔ میں نے اُس سے کہا تھا۔ بچہ ہونے سے ہماری محبت بٹ جائے گی۔ ـــــ مگر وہ آرزو کرتی رہی۔ پھر ایک روز ـــــ ....''

''ایک روز ـــــ ....''

''ایک روز اُسے اُمید بندھ گئی۔ مگر ـــ ....'' وہ رک گیا۔ پھر گہرا سانس لیتے ہوئے بولا ''مگر چوتھے یا پانچویں مہینے یہ حمل آپ ہی آپ گر گیا وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی ـــ ایسی بیمار ہوئی کہ ـــ ....''

اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے گہرے درد سے اُس کا دل بھی بے اختیار متاثر ہو اُٹھا ہے۔

اُس نے ہاتھ بڑھا کر اُس کے ہاتھ کو چھوا۔ اور اُسے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

پھر کسی نے کوئی بات نہ کی۔ وقت گزرتا گیا۔ گزرتا گیا۔ نیند کے ہلکے ہلکے ہلکورے اُس پر غلبہ پانے لگے۔ اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ وہ اونگھنے لگی۔ اُس کا جسم ڈھیلا ہو گیا۔

تب اُسے محسوس ہوا اُسے کوئی کندھے سے جھنجھوڑ رہا ہے۔

''سنو'' ایک آواز بار بار کہہ رہی تھی۔

''کیا ہے''؟ ـــ وہ چونک پڑی

''ایک بات تو میں بتانا بھول ہی گیا تھا۔ سنو گی؟'' اُس کی آواز ہانپ رہی تھی۔

"کہو" اُس نے کہا۔

وہ بتانے سے پیشتر، بستر سے اُتر کر ایک بار پھر کمرے کے دوسرے کونے میں دریچے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ کافی دیر وہاں کھڑا وہ باہر کے اندھیرے میں نہ جانے کیا دیکھتا رہا۔ وہ اُس کی بات کی منتظر تھی۔ اُس کا دل ہلکے ہلکے کانپتا رہا۔ نہ جانے کون سی ایسی بات باقی رہ گئی ہے؟ نہ جانے وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ وہ مجسم اشتیاق بن کر اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ ہلکے اندھیرے میں اُس کا شبیہہ عجیب پُر اسرار بن گیا تھا۔ اور دور کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ اور سگرٹ کا بے تاب دھواں غباروں کی صورت میں ہر طرف بکھرتا جا رہا تھا۔

سگریٹ کے گہرے گہرے کش لینے کے بعد وہ بے قراری سے اُس کی طرف بڑھا ___ "سنو گی؟"

"ہاں!" اُس نے محسوس کیا کہ یہ "ہاں" اُس کے حلق کی بجائے اُس کی آتما سے نکلی ہے۔

وہ تیزی سے آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اُس نے محسوس کیا۔ ۔ ۔ وہ بے قرار ہے۔ اُس کے اندر طوفانوں کا تلاطم ہے۔ اور پھر جیسے وہ کوئی بے انتہا خطرناک بات کہنے جا رہا ہو۔ اُس نے ایک بارگی اُگل دیا ___ "وہ ___ وہ بے وفا تھی ___" یہ بات کہنے کے بعد اُس نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ شاید وہ اپنے اندر کے طوفانوں پر قابو پانے کی سعی کر رہا تھا۔

اور وہ سر سے پیر تک لرز گئی۔ چونک کر اُس نے سر اُٹھایا۔ آنکھیں پھاڑ کر اُس کی جانب دیکھتے ہوئے ایک ہی لفظ اُس کے منھ سے

نکلا" کیا" ——؟

اُسے محسوس ہوا اُس کا حلق سوکھتا جا رہا ہے۔

"ہاں!" اُس نے منھ پھیرے بغیر جواب دیا۔ "ہاں! وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔ کسی اور کو ——— اُس نے ساری زندگی مجھ سے محبت نہیں کی —— ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں" ——

"جھوٹ —— یہ کبھی نہیں ہو سکتا" —— اُس کی سانسیں اُٹھنے بیٹھنے لگیں۔

"جھوٹ ہے ———" وہ تیزی سے مڑا۔ اُس کے قریب آگیا سلگتی آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ —— "تم کہتی ہو کہ یہ جھوٹ ہے، نہیں، نہیں —— یہ جھوٹ نہیں۔ میرے پاس اس کا ثبوت ہے، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ——— .... "

پھر دور کمرے کے دوسرے کونے میں چلا گیا۔

"کیا دیکھا تم نے —— ؟"

"اسے اپنے میکے کے شہر سے ایک لڑکے سے محبت تھی۔ اس کے ساتھ وہ بچپن سے کھیلی۔ ان دونوں کی آپس میں شادی کی بات بھی چلی۔ دونوں نے محبت کے اونچے اونچے محل بنائے تھے دونوں کافی عرصہ تک ایک دوسرے کے قریب رہے۔ میں نے غلطی سے اُس کا ایک خط کھول لیا تھا جو ابھی تک میرے پاس ہے —"

پھر خاموشی چھا گئی۔ یہ خاموشی بہت خطرناک تھی۔ مرد کا سینہ زہر کے تیر دل

سے بجھا ہوا تھا ۔ وہ بستر سے اُتر کر اُس کے قریب جا کھڑی ہوئی ۔ اور متحیر آواز سے کہنے لگی ـــــ " اور تم پھر بھی اس سے اتنی شدید محبّت کرتے رہے؟"

" ہاں ! ـــــ اس کے بغیر چارہ ہی کیا تھا ـــــ "

خاموشی ـــــ طویل خاموشی

وہ پھر اُسے اپنے بستر پر لے آئی ۔ اپنے قریب سلا کر وہ عجیب نظروں سے دیکھنے لگی ۔ ان نظروں میں ایک نئی اور انوکھی کیفیت تھی ۔ تعریف کا ایک ایسا جذبہ ، جو پوجا کو چھو کر گزرتا ہے ۔ اور بار بار سوچ رہی تھی ۔ یہ انسان کیسا ہے ؟

اور وہ انسان سسکتے ہوئے کہہ رہا تھا ۔ " وہ بے حد خوب صورت تھا ۔ اُس کی آنکھیں میری طرح چھوٹی سُتی ہوئی نہ تھیں ۔ اُن پر میری عینک کے دبیز شیشے نہ تھے ۔ اندر گھسے گال نہ تھے ۔ لمبوترا چہرہ نہ تھا ۔ وہ بے حد خوب صورت تھا ـــــ بے حد ۔ بے حد ـــ ..... "

اُس نے آہستہ سے پوچھا " کیا وہ جانتی تھی کہ تمہیں یہ راز معلوم ہے ؟ "

" نہیں ـــــ " اُس نے کہا " میں نے آخری دنوں تک یہ ظاہر نہ ہونے دیا ۔ موت سے چند منٹ پہلے مجھے محسوس ہوا تھا ۔ جیسے وہ سخت کشمکش میں ہے ۔ اور مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے ۔ مگر میں نے اُسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا ۔ البتہ تسلّی کے لفظ کہتا رہا ۔ اور اُس نے آخری ہچکی لی اور ختم ہو گئی ـــــ "

کچھ دیر کی خاموشی میں، ایک ہلکی سی سسکی کی آواز سنائی دی۔
پھر وہ کہنے لگا: "آخر اُس پر یہ راز ظاہر کرنے کا فائدہ بھی کیا تھا؟"

پھر جب اُس کے پہلو میں لیٹا مرد، نیند کی گود میں لڑھک گیا تو وہ بہت دیر تک اُس کے چہرے کے جانب ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ اُسے نیند نہ آئی آنکھوں کے کونوں میں لرزتی جاگتی نیند کہیں رخصت ہو گئی تھی۔ وہ اُس کے چہرہ سے اپنی نگاہ نہ ہٹا سکی۔ اور وہ چپ چاپ اُس کے قریب سویا رہا۔ جیسے یہ نیند مدتوں کے انتظار کے بعد پہلی بار ان آنکھوں کو میسر ہوئی ہو۔

پھر نہ جانے کب کیسے اُسے محسوس ہوا۔ مرد نے سوتے ہی میں ایک سسکی لی۔ درد و اندوہ سے بھرا دل۔ وہ کچھ دیر اُسے اسی طرح چپ چاپ دیکھتی رہی۔ پھر اُس کا دل پگھلتا گیا۔ موم کی طرح نازک بنتا گیا۔ سیال چیز کی مانند بہنے لگا۔ اور جیسے کوئی بچہ سوتے سوتے ڈر جائے اور ماں اُسے اپنی چھاتی سے چپکا لیتی ہے۔ اسی طرح اُس نے یکبارگی اس کی گردن میں اپنی بانہیں حمائل کر دیں اور اُسے اپنے سینے سے بھینچ لیا۔

محبوبہ

[پارٹ وَن]

"طلعت" میں نے کہا۔
"ہُم" وہ گنگنائی۔
"تم خوبصورت ہو" میں نے کہا۔
اُس کے خمیدہ لب کپکپانے لگے
"تم ایک بہار ہو"
اُس نے کچھ نہ کہا
"میں تمہیں پسند کرتا ہوں"
وہ مسکرادی
"میرے پاس آؤ"
وہ میرے پاس آگئی
"بیٹھ جاؤ"
وہ بیٹھ گئی۔

میرا دل سُلگنے لگا۔ میں نے اُس کے خوبصورت بال لہرا دئے اور اُس کی جھیل کی طرح گہری نیلی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے میں کہنے لگا۔ "طلعت! تم میری زندگی پر چھا گئی ہو۔ تم میرے خوابوں کی تعبیر، محبت کی انتہا۔ اور خیالوں کی ساتھی بن گئی ہو۔ میں۔

میں تم سے محبت کرتا ہوں ـــــ" میں اُس کی طرف جھک گیا۔

وہ آہستہ سے اُٹھی۔ اُس نے دریچے کے باہر دیکھا۔ اپنے سینے پر آنچل پھیلا دیا اور میری بات کا جواب دیئے بغیر چلی گئی۔

بہار ڈوب گئی۔

اور کارلٹن ہوٹل میں آرکسٹرا بج رہا تھا۔

× × × × × × ×

کارلٹن ہوٹل میں آرکسٹرا ابھی تک بج رہا تھا

بلوریں میزوں اور مرمریں جسموں اور بے پرواہ آنچلوں اور بال روم کی ہلکی نیلی روشنی اور سگرٹ کے دھوئیں سے بھرے ہوئے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے کہا "آؤ ناچیں ـــ"

وہ میرے ساتھ آگئی۔

بال کی روشنی ہلکے سایوں میں مبدل ہو گئی۔

"اندھیرا ہو گیا" میں نے کہا

"ہُم" اُس نے حامی بھری

میرا جسم اُس کے لمس سے کانپنے لگا۔ اُس کی کمر کے گرد میرا بازو لرزنے لگا۔ ایک خفیف سے جھٹکے سے میں نے اُسے کھینچ لیا۔ وہ وارفتگی کے عالم میں کھنچی چلی آئی۔ اُس کی پلکیں آہستہ آہستہ بند ہوتی گئیں۔ ہم دونوں ناچتے ناچتے باہر بالکونی میں آگئے۔

"طلعت" میں نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

اُس نے پلکیں نیم وا کر کے اوپر میرے چہرے کو دیکھا۔
"کس قدر مکمل رات ہے!" میں بہک رہا تھا۔
وہ آہستہ سے مسکرادی۔
"لوگ اونگھ رہے ہیں۔ جام خالی ہو چکے ہیں۔ جسم کسمسا رہے ہیں۔ سامنے سمندر کی لہریں ہیں۔ تمہاری چھاتیاں سمندر کی ان وحشی موجوں کی طرح اونچی ہی اونچی اُٹھ رہی ہیں۔ مغرب میں ناریل کے پتے ناچ رہے ہیں۔ اُن کے پیچھے رات اپنا آنچل سمیٹے مسکرا رہی ہے۔ اور یہاں ہم دونوں تنہا ہیں۔——
تم ——تم پر کوئی جذبہ طاری نہیں ہو رہا——!"
وہ پھر مسکرادی
اُسکی گردن کی نزدیکی کے احساس سے میرے ہونٹ سوکھنے لگے۔
یکایک آرکسٹرا رک گیا۔
وہ بے دم سی میرے سینے پر گر پڑی۔
سامنے سمندر تھا۔
رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی
اس طرف اندھیرا تھا۔
اردگرد کوئی نہ تھا۔
میرے ذہن میں اُس کے ہونٹوں کو چوم لینے کی دیرینہ خواہش اُبھر آئی
میں نے اُنھیں چوم لیا۔
پھر جیسے یکبارگی فضا متزلزل ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں میں آگ آ چکی

ہونٹ نفرت سے سکڑ گئے۔ اُس نے بپھر کر ایک تھپڑ میرے گالوں پر جڑ دیا۔
میرے ارد گرد ہیولے ناچنے لگے۔

[پارٹ ٹو]

"ڈارلنگ" میں نے کہا۔ "غصہ تھوک دو ڈارلنگ ——— دور کوئی گڈریا الغوزہ بجا رہا ہے ——— نہیں یہ تو تمہارے اپنے سانسوں اور ہچکیوں کی بازگشت ہے۔ رات گہری آرہی ہے۔ سرمئی دھند لکا چھا رہا ہے۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں ایک سنہری لکیر بنا رہا ہے۔ فضا خوابیدہ ہے اور تم اُداس ہو! کیوں ——؟ کیا اس لئے کہ تمہاری منگنی ہو گئی ہے؟ —— مگر اس میں اُداس ہونے کی کیا بات ہے؟ راشد ایک اچھا لڑکا ہے۔ کمال منزل کے اُس پار اُسکی کوٹھی ہے۔ پلازا میں کبھی کبھی ادھر سنڈے کو آیا کرتا ہے۔ رقص میں لڑکیاں اُسے پارٹنر بنا ناخوش قسمتی سمجھتی ہیں ——— .... تچ تچ ——— کیا ——— رومال دوں ——؟ روتی کیوں ہو؟ میں نے ایکبار تم سے کہا تھا میں تم سے محبت کرتا ہوں میں نے غلط کہا تھا —— مگر تم کچھ بولتی کیوں نہیں؟ —— ...... طلعت۔ طلعت ڈارلنگ آج اتنے دلوں بعد ملی ہو اور یوں گُم سُم ہو؟ —— وہ یاد ہے۔ پچھلے اتوار کی شام —— ؟ مگر مجھے تو وہ شام یاد ہے اور کبھی نہ بھولے گی —— میں —— میں ایک مرد ہوں ہمیشہ سے سہتا آیا ہوں۔ مگر تمہاری آنکھوں میں میرے لئے ہمدردی کیوں؟ مجھے

تو محبت کرتی ہے مگر تجھے — .... نہیں، میں نے غلط سمجھا۔ تم میری طرف کہاں دیکھ رہی ہو۔ تم تو دور اُفق کی خلاؤں میں گھور رہی ہو۔ تمھاری آنکھوں میں اُداسی نہیں۔ مسرت کی لکیر ہے۔ تم خوش آیند تصورات کے ہلکوروں میں محو ہو۔ میں تو یونہی — .... کیا گاڑی کا رُخ موڑ دوں؟

× × × × ×

"طلعت" میں نے کہا

اُس نے میری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

میرا دل ڈوب گیا

"مبارک ہو" میں نے آہستہ سے کہا

صحنک میں خیمہ تھا۔ اس سے پرے ڈومنیاں اپنے پھٹے لہجوں میں گا رہی تھیں۔ چاند ناچ رہا تھا۔ شمعیں روشن تھیں۔ کنواریاں چپ چاپ تھیں اور ذہن میں اَن ہونی آشاؤں کے طوفان چھپائے بیٹھی تھیں۔ کلیجے دھک رہے تھے۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اور میری آنکھوں میں ایک آنسو تھا۔

طلعت نے مجھے دیکھا۔ پھر چاند کو دیکھا۔ پھر ہاتھ بلند کئے۔ ایک انگڑائی لی۔ میرے دل نے کہا۔ "اپنے مرکز کی جانب مائل پرواز — ......"

مگر میں نے اُس سے کچھ نہ کہا اور وہ چلی گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میری حیثیت یہاں اجنبی کی سی ہے۔

"مغرور لڑکی" میرے ذہن میں ہتھوڑے چلنے لگے۔

عین اُسی وقت باہر شہنائی کی سُر بلند ہوئی۔ کسی نے بابل کا سُر چھیڑ دیا

میں محبت کے آنسو پونچھنے لگا۔
کتنی مغرور ہو گئی تھی آج طلعت
____؟
اور شہنائیاں بجتی رہیں۔
اور شہنائیاں ڈولی کو لیکر چلنے لگیں۔
اور شہنائیاں ہچکیوں میں ڈوب گئیں۔
اور شہنائیاں معدوم ہو گئیں۔
اور ایک کھٹک سی دل میں رہ گئی
بابل کے گیتوں کی کھٹک ___!

(پارٹ تھری)

طلعت سسرال سے لوٹ آئی مگر میں اُس سے ملنے نہ گیا
پھر ایک روز طلعت مجھے کارلٹن میں ملی تو میں منھ پھیر کر چلا آیا۔ میری آنکھوں میں چند آنسو اُبھر رہے تھے۔
مگر ایک روز سمندر کے کنارے اُس نے میرا ہاتھ پکڑ ہی لیا۔
"انور" اُس نے کہا
میری آنکھوں میں شکوے تھے اور زبان چُپ ___
"کیسے ہو ___؟" وہ میری آنکھوں کے گرد حلقے دیکھنے لگی۔
میں چپ رہا

وہ بھی چپ ہو گئی۔

ہم دونوں پہلو بہ پہلو چلنے لگے۔

"تم کیسی ہو"؟

اُس نے بھی جواب نہ دیا۔

ابھی تک ایک مغرور لڑکی ___؟ جس نے کبھی بھی میری محبت کی قدر نہ کی۔ جس نے مجھے انسان تک نہ سمجھا۔ جس کے حسن کے آگے میں نے گھٹنے ٹیک دئے جس نے میری محبت کے رخسار پر تھپڑ مارا۔ جس نے ___ ....

مگر اب تو اس کی شادی ہو گئی ہے۔ راشد حسین ہے۔ دولتمند ہے اُس کی دو کاریں ہیں بی اے پاس ہے۔ وہ مجھے خاطر میں کب لائے گی۔ مجھے اُس سے کوئی اُمید نہیں رکھنی چاہیئے۔ مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیئے۔ کہیں دور چلے جانا چاہیئے ورنہ وہ مجھے کہیں کا نہیں رکھے گی۔ میرے صبر کا پیمانہ ٹوٹ جائیگا۔ وہ مغرور ہے میرے احساسات کو روندتی آئی ہے۔ وہ مغرور ہے ___ ....

اُس نے اپنا دوسرا ہاتھ بڑھا دیا۔ اُس کی کلائیوں میں کالی چوڑیاں تھیں۔ ناخنوں پر گلابی رنگ تھا۔ ہتھیلیوں پر مہندی کے معدوم ہوتے داغ تھے ___ مگر میں نے اُس کا ہاتھ نہ پکڑا۔ اور اپنا ہاتھ بھی چھڑا لیا۔ اور اُسے اکیلا چھوڑ کر چلا آیا۔ اپنی شکست پر آنسو بہانے کیلئے ___ تنہائی میں ___ اُس نے مجھے بلایا مگر میں نہ رکا۔ اور چلا آیا ___ آخر کیوں رُکتا میں ___؟

ناریل کے پتوں کے بیچوں بیچ ہوا سرسراتی ہوئی گزر رہی تھی۔

× × × × ×

سامنے سمندر تھا۔ مغرب میں ناریل کے پتے اُسی طرح ناچ رہے تھے۔ ان کے پیچھے آفتاب ڈوب رہا تھا۔ آرکسٹرا معدوم ہو رہا تھا اور روشنی بال روم کے سایوں سے اُلجھ رہی تھی۔

"انور" طلعت نے کہا

"ہُم" میں نے کہا

"فضا کتنی خوبصورت ہے ——!"

میں چپ رہا

عین اُسی وقت پھر آرکسٹرا کا آغاز ہوا۔

"آؤ ناچیں" اُس نے کہا

اُس کے پاؤں موسیقی کی لہروں کے ساتھ تھرک رہے تھے۔

میں چپ چاپ اُس کے ساتھ ناچنے لگا۔

ہلکا اندھیرا فضا پر محیط ہو چکا تھا۔

اُس نے میرے کوٹ کے کالروں سے کھیلتے ہوئے کہا "تم کس قدر خوبصورت ہو"

اُس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی۔

میں نے اُس کے خاوند کا ذکر چھیڑ دیا۔

وہ کپکپانے لگی۔

دور سامنے سمندر کے کنارے ذرا ہٹ کر شام کے ڈوبتے سورج کے پرے پلازا کی عمارتیں تھیں۔ پلازا سے ملحق اس کے خاوند کی کوٹھیاں تھیں جنکی دیواروں کے مابین وہ اُس کے ہونٹوں کو چوما کرتا ہوگا۔!

یکایک موسیقی رک گئی۔

اُس نے اپنا سارا بوجھ مجھ پر ڈال دیا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ تبسم جو اُس کے خاوند کے بوسوں نے پیدا کر دیا تھا۔ اس کے بال اس کے ماتھے پر بکھرے تھے۔ جو کالے بھی تھے۔ قرمزی بھی۔ سنہری بھی۔ اور یاقوتی بھی ـــ جو ٹیڑھی ترچھی لکیروں کی طرح ہوا کے مدھم جھونکوں کے ساتھ ناچ رہے تھے۔ لرزاں تھے ـــ وہ میری گود میں یوں پڑی تھی گویا میرے لمس کی لذت سے اُس کے اعصاب پر ایک خمار، ایک غنودگی سی چھا گئی ہو ـــ جیسے میں ـــ ...... مگر میں کیوں ـــ شاید وہ اپنے خاوند کی آغوش سمجھ کر اس طرح کی بے تکلفی برت رہی ہو ـــ وہ تو مجھے ایک کھلونا سمجھتی ہے ـــ .... محض ایک خوبصورت بے حس بُت ـــ پھر میں کیوں اسے اس طرح اپنی آغوش میں تھامے ہوں! جیسے وہ بلور ہو۔ اور اگر میں نے اُسے چھوڑ دیا تو وہ زمین پر گر کر چکنا چور ہو جائیگی

عین اُسی وقت پھر آرکسٹرا بجنے لگا۔

اس کے پیر موسیقی کی لہروں کیساتھ تھرکنے لگے۔

"نزدیک ہو جاؤ" اُس نے یکایک مجھ سے کہا اور میرے اعصاب سلگنے لگے

"تم حسین ہو ـــ بے انتہا حسین ـــ" وہ کہنے لگی۔ "راشد حد درجہ ذلیل آدمی ہے ـــ اُس کے کتنے بڑے بڑے ہونٹ ہیں۔ گھناؤنے ـــ ان سے شراب کی کڑوی بو آتی ہے۔ اس کے دانتوں کے تعفن سے میرا دم گھٹ جاتا ہے۔ اس کے بوسوں سے میرے رخسار چھل گئے ہیں۔ وہ کس قدر ظالم ہے ـــ ! پہلی رات جب اُس نے میرے رخساروں کو چھوا تو محسوس ہوا تھا کہ مجھے ایک گھناؤنے غار میں ڈھکیل دیا گیا ہے ـــ ...... اُفوہ ـــ ..... مجھے اس سے کس قدر نفرت ہے ـــ .... آہ ..... اسی لئے تو ـــ

اسی لئے تو اس رات جب میں بیجر آنند کیساتھ ناچی اور اس نے میرے رخساروں کو چوما اور میری چھاتیوں پر ہاتھ ڈالا تو میں ایک عجیب لذت کے بارے سکرانے لگی اور اس کے ساتھ چمٹنے لگی ۔ آج تم بھی اس کی طرح ۔......"

آرکسٹرا رک گیا ۔

وہ بے دم سی میرے سینہ پر پڑی تھی ۔

سامنے سمندر تھا ۔

رات ڈوب رہی تھی

اس طرف اندھیرا تھا ۔

سامنے اس کے ہونٹ تھے ۔

میں نے اس کے ہونٹوں کو چوم لینا چاہا

مگر میں یکبارگی دور ہٹ گیا ۔ میں نے انھیں نہ چوما اور میں نے پہلی بار دیکھا یہ "آہ وہ" دعوت عمل دیتے ہوئے ہونٹ کس قدر بدصورت ہیں؟ بدصورت اور مکروہ ۔ جسے بر کسی نے چوما — جسے جانے کتنے بیجر آنندوں ، کتنے راشدوں ، کتنے شرابی دانتوں اور موٹے موٹے متعفن ہونٹوں نے کتنی بار چوما — اُوہ ! میں کانپ اٹھا — میری روح کی رگ رگ کی لرزش میں کھنچ گئیں ۔ آج ایک عورت کی تقدس ننگی ہو کر میری آغوش میں مچل رہی تھی — میں نے اسے چھوڑ دیا ۔ میں نے جانا چاہا ۔ مگر یکبارگی اس نے میری گردن کے گرد اپنے بازو حمائل کر دئے اور میرے ہونٹوں میں اپنے ہونٹ گاڑ دیئے ۔

مجھے آگ لگ گئی ۔ فضا گھوم گئی ۔ نفرت سے میرا جسم کانپنے لگا ۔ نہایت سختی سے اس کا چہرہ دور ہٹا کر میں نے اس کے گالوں پر ایک تھپڑ جڑ دیا اور

چلا آیا ——— ایک بار پہلے بھی ایسا ہوا تھا۔ مگر وہ کہانی کا آغاز تھا اور یہ انجام ———

میں نے باہر آکر دیکھا۔ دور افق میں ابابیلیں تیر رہی تھیں۔

———

زہر

شمع کی لو جھلملا رہی تھی۔ دور دریچے سے باہر چاند دکھائی دے رہا تھا۔ بائیں جانب کے ہوٹل پلازا سے موسیقی کی لہریں آرہی تھیں۔ شاردا نے چاند کی طرف دیکھ کر انگڑائی لی۔ ابھی ابھی اُس کا خاوند ڈاکٹر بھاٹیہ کسی راجہ صاحب کے ہاں چلا گیا تھا۔ جن کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ اور آج کی رات وہ پھر اکیلی تھی ــــ

کپکپاتے ہوئے ہوا کے مترنم جھونکے آرہے تھے۔ اُس نے روشنی بجھا کے دریچے سے باہر چاند کو دیکھنا شروع کیا ــــ زرد چاند ــــ ایک فانوس ــــ.... جیسے خواب کا ایک دیوتا ــــ......

کب؟ کیا ہوا تھا؟ کچھ بھی تو نہیں ہے ــ کچھ بھی تو نہیں ــ اُس کا خاوند اُس سے کتنا پیار کرتا ہے۔ مگر اتنی خوب صورت رات اور یہ تنہائی ــ......!"

رات گزری جارہی ہے۔ مرمریں ٹخنوں پر جھانجھیں باندھے۔ رات گزری جارہی ہے ــ خراماں، خراماں ــــ رات جو کسی کی محبوبہ ہے۔ رات جس کا جھومر چاند ہے ــ شاید اُسے کسی سے محبت ہے۔

محبت ــــ؟

کتنا خوب صورت جذبہ ہے۔ کیا؟ نہیں نہیں، اُسے یہ باتیں نہ یاد

کرنی چاہئیں ــــ مٹی کے جگمگاتے چراغ ۔ وہ دن ۔ اُن کہے اُلجھے خواب ـــ

....

ایک روز وہ اسکول سے جلد آگیا تھا۔ چند لمحے نیچے ماں کے پاس بیٹھ کر کسی بہانے اوپر آگیا۔ دروازے کے پاس ایک سائے کی طرح ـ ....

"شاردا" محبت بھرا لہجہ۔

"جی"

"کیا کیا جارہا ہے؟"

"پڑھ رہے ہیں"

"کہانیاں؟"

"جی"

نیم وا پلکیں ــ "اُف تم کتنی خوب صورت ہو شاردا!"

حسن لجا گیا۔

"ایک بات مانو گی؟"

"کہئے"

"آج کسی بہانے سے ہمارے یہاں آجانا۔ آؤ گی؟"

"جی ـ ......"

"ہاں کل شانتی سسرال سے آرہی ہے۔ اس سے ملنے آجانا۔ میں اوپر ملوں گا۔ اپنے کمرے میں۔ آؤ گی نا؟"

....

اور ایسے ہی ایک روز ـــــــ

"شاردا میں نہیں جانتا کہ تم میں کیا ہے۔ مگر میں صرف یہ جانتا ہوں کہ تمھارے بغیر میری زندگی ادھوری ہے۔ تم میرا سپنا ہو۔ جو کچھ تم میں ہے وہ کسی دوسرے میں نہیں ہے۔ تم ـــ میں تمھیں ہر وقت اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان دوراہوں پر۔ خوب صورت پگڈنڈیوں پر۔ ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے زندگی کی منزلیں طے کریں۔ بس یہی میری خواہش ہے۔"

....

اور پھر یوں ہے ایک خط ـــــــ

شاردا

میں تعلیم کے سلسلہ میں یہاں آ تو گیا۔ مگر زندگی تمھیں دیکھے بغیر ایک ڈوبا ہوا تار محسوس ہو رہی ہے۔ میں تم سے زیادہ عرصہ تک دور نہ رہ سکوں گا۔

تمھارا

....

اور دوسرا خط ـــــ

یہاں امتحان ہو رہے ہیں۔ مگر کتاب کے ہر صفحہ پر تمھارا ہی چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ تم آج کل بہت اداس رہنے لگی ہو۔ کیا بات ہے آخر؟ مجھے کچھ نہ بتاؤ گی؟

تمھارا

....

پورن

اور چند مہینوں کے بعد خود اُس نے آخری خط لکھا تھا۔

"پورن!

کیا تمہاری بے وفائی کو ایک چٹیل ویرانہ سمجھ لوں۔ جہاں چٹان کی اوٹ میں میں نے کبھی ایک پھول دیکھا تھا ——— ہماری بچپن کی یادوں کا پھول ——— اور جہاں اب بگولے ہی بگولے ہیں۔ پورن۔ جلد آؤ۔ خدا کے لئے۔ جلد آؤ۔ دیر نہ کرو۔ کہیں مجھ سے مل بھی نہ سکو۔

تمہاری

شاردا

....

اور پھر سب سے آخری خط ———

"پورن

میری شادی کسی اور سے طے پائی ہے۔ تم مجھے بھلا دو۔

کسی کی

شاردا

....

اور شادی سے دو روز پہلے ———

گھر میں ہنگامے تھے۔ دروازے پر شہنائیاں تھیں۔ صحن میں ڈھولک تھی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

یکایک وہ اُس کے سامنے آگیا۔ پورن ۔ اُلجھے بال ۔ پریشان صورت بڑھی ہوئی ڈاڑھی ۔ پھٹے پائینچے والا پاجامہ ....

پورن نے آکر اُسے کندھے سے پکڑ لیا ۔

" شادی کر رہی ہو ؟ "

" میں مجبور ہوں پورن — "

" چلو بھاگ چلیں " — بھڑکتی آنکھیں ۔ کپکپاتے ہونٹ ۔

" پورن — ! " وہ تقریباً چیخ پڑی ۔

" ہاں شاردا ۔ چلو اس سماج سے انتقام لیں ۔ چلو چلو ایک نئی دنیا ہمارا انتظار کر رہی ہے ۔ ایک خوب صورت دنیا ۔ چلو — .... ان بے کیف زنجیروں کو توڑیں ۔ یہ غم بداماں بدلیاں ۔ میرے دل میں آگ سلگ رہی ہے ۔ چلو شاردا ۔ چلو — "

" نہیں " — آنسو — " نہیں " — آنسو — " نہیں " ۔ سسکیاں ۔

" میں نہ جاسکوں گی ۔ میں نہ جاسکوں گی ۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا ۔ تم چلے جاؤ ۔ تم چلے جاؤ — "

اور کمرے میں ٹنگی ہوئی پورن کی بڑی تصویر پورن کی ٹھوکر سے چکنا چور ہوگئی ۔

اور باہر شہنائیاں سسک رہی تھیں ۔

وہ چلا گیا

رات کا آخری آنسو بہہ نکلا ۔

سسکیاں ۔ سسکیاں ۔

اور ایک ڈولی چلی ۔ نئے انجانے دیس ۔

کارواں لٹ گیا ۔ ....

تارے ڈبڈبا رہے تھے ۔ شاردا نے آنکھیں کھول لیں ۔ پلکوں پر آنسو منجمد ہو گئے تھے ۔ اُس نے سسکتے سسکتے کہا ۔ "پورن" اور تصویر کے ٹکڑے چن لیے ۔ جیسے وہ اسکی تصویر کو سینے سے بھینچ رہی ہو ۔

اور آج کی رات پھر وہ اکیلی تھی ۔ چاند بھی اکیلا تھا ۔ چاندنی بھی اکیلی تھی ۔ اُس کا خاوند باہر گیا تھا ۔ اور یہ تنہائی ـــــ .....؟

(دوسرے روز)

اُس کے چہرے کے مانوس نقوش بدلنے لگے ۔ ڈاکٹر بھاٹیہ پورن کو اپنے ساتھ

گھسیٹ لایا "پورن آیا ہے ۔ سنتی ہو ۔ پورن آیا ہے :"

پورن ————؟

جیسے سیارہ ٹوٹ گیا ہو ۔ یک بیک فضا میں ایک گیت گونج اٹھا ہو ۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی نیچے اتر آئی ۔ پورن آیا ہے — پورن ۔

پھر یکایک اس کے جسم پر ایک کمزوری سی چھا گئی ۔ پورن آیا ہے —؟ مگر کیوں —؟ وہ اس کے سامنے کیسے جائے ؟ کیا کہے گی ؟ وہ یہاں کیوں آیا ہے ؟

بھاٹیہ نے کہا — "شاردا نیچے آؤ ۔"

اور پورن نے دیکھا ۔ کالے آنچل سے جھلکتے ہوئے ایک اداس چہرے والی سکڑی سمٹی عورت کمرے میں آ رہی ہے ۔ دبے دبے پاؤں ——"میں مر جاؤنگی" اس نے کہا تھا "میں تم سے جدا ہو کر مر جاؤنگی ۔ یہ میں جانتی ہوں ۔ مگر اپنی تقدیس کے آنچل کو دنیا والوں کی زد میں نہ آنے دوں گی ۔ میں تمہارے ساتھ نہ بھاگوں گی اور گھٹ گھٹ کر جان دوں گی — پورن ، میں زہر کھا لوں گی :"

اور سچ مچ اس نے زہر کھا لیا تھا ۔ اس کا وجود آہستہ آہستہ مٹ رہا تھا —

بھاٹیہ باہر چلا گیا ۔ پورن لپک کر اس کے پاس آیا ۔ کہا "تم خوش ہو شاردا — ہے نا ؟"

"ہاں !" جذبات سے لبریز ایک آواز ۔ ایک گھٹن ۔

اور نغمہ مر گیا۔ گیت دب گیا۔ پورن کے احساسات سرد پڑ گئے۔ وہ چپ چاپ کرسی میں دھنس گیا۔

"تم کیسے ہو!" شاردا نے پوچھا

پورن نے ایک سگرٹ سلگایا۔ اور دریچے سے باہر دیکھنے لگا۔

دونوں چپ ہو گئے۔ فضا بھی چپ تھی۔ اور احساسات بھی۔ اور دلوں میں سمندر تھے۔

اور وہ رات موت کی مانند اندھیری تھی۔ شمع کی لو تھرتھرا رہی تھی۔ بھاٹیہ آج بھی راجہ صاحب کے ہاں گیا تھا۔ اور آج رات شاردا پھر اکیلی تھی۔ اور چپ چاپ اپنے بستر میں دھنسی چھت کے کالے شہتیر گن رہی تھی۔

آدھی رات ــــ سرد تاریک تارے مضمحل سکوت ــــ ایک خاموش نغمہ تنہائی کے ساز پر بجا۔ اور دونوں جوان دلوں میں لرزتا ہوا۔ کانپتا ہوا ایک واماندہ گیت ــــ دبا دبا سا ــــ

پورن اٹھا۔ اوپر زرد چاند تھا ــــ اندھیرا ــــ وہ کہاں جا رہا ہے؟ کیوں جا رہا ہے؟ ــــ تنہائی ــــ؟ پھر کیا ہوا؟ اوہ! رات کس قدر خوب صورت ہے

آدھی رات ۔ جیسے پلکوں سے چپکا ہوا آنسوؤں کا ایک قطرہ ۔
دور کمرے کے دروازے کے پاس ایک سایہ لرزا ۔ پژمردہ چراغ ۔
شاردا سہمی ۔

"کون ہے"؟

سکوت

"کون آرہا ہے"؟ خوف

"آنے والا جواب کیوں نہیں دیتا؟ کون ہے؟ کون ہے؟" ۔ اور ایک طویل چیخ ۔

اور سایہ اپنے کمرے میں جاکر اپنے پلنگ پر بے دم سا گر پڑا۔

اور جب سایہ کمرے کی موڑ میں ڈوب گیا تو شاردا لڑھکتی ہوئی، تھکی ماندی سی اپنے پلنگ میں جاکر بلکنے لگی ۔

۔ سسکتے، سسکتے ۔ "آجاؤ ۔ آؤ ۔ میرے محبوب ۔ میں مدتوں سے تمہارا انتظار کررہی ہوں ۔ کوئی نہیں آئے گا ..... میں یہ اکیلی راتیں تمہارے انتظار میں کاٹا کرتی ہوں ۔ آجاؤ ۔ آجاؤ ۔" اور سسکیاں ۔ سسکیاں ۔ ......

(تیسرے دن)

"میں جا رہا ہوں"۔۔ بکھری صورت۔ پریشان بال۔ ہاتھ میں اٹیچی۔
"اُن کا انتظار بھی نہ کروگے؟" وہ بستر میں دبکی ہوئی تھی۔ "ڈاکٹر
صاحب آٹھ بجے کے قریب ڈیوٹی سے لوٹ آیا کرتے ہیں"۔۔.....
مگر وہ چلا گیا۔ وہ دیکھتی رہی۔ ایک سایہ رینگتا ہوا جا رہا تھا۔ پگڈنڈی کے
موڑوں سے پرے ـــ دور ـــ جہاں سے وہ لوٹ کر نہ آئے گا ـــ تنہا
۔ اس طویل سڑک کی طرح اکیلا ـــ تھکا ماندہ ـــ

اور دوسرا سایہ چپ چاپ اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ بڑی بڑی آنکھوں
سے ـــ جن میں آنسو نہ تھے۔ جذبے نہ تھے۔ شکوے نہ تھے۔ بے وفائی نہ تھی۔
صرف ایک ویرانی تھی۔ کھنڈر تھے۔ اور اس چپ چاپ سی ویرانی اور ان
کھنڈروں کے پیچھے ایک طوفان ـــ .....

باہر بھی طوفان آنے والا تھا
اور شاردا سوچ رہی تھی کہ زہر صرف اُس نے ہی نہیں کھایا۔ پورن نے بھی کھا لیا ہے۔
اور دونوں کا وجود ایک ساتھ ہی آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔ یہ بات سوچ کر اُس کے
ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔
باہر سوکھے پتے تالیاں بجا رہے تھے۔

حسن کی قیمت

کردار :-

ایک مرد

ایک عورت

(گاڑی چل رہی ہے۔ بستی کے شمالی حصہ میں چھوٹی لائن سے مرد عورت کو بیاہ کر کانپور لئے جا رہا ہے۔ ٹیگوں تاروں بھری رات ہے۔ گاڑی پچھلے اسٹیشن سے ابھی ابھی چھوٹی ہے۔ مرد کے سر پر ابھی تک پھولوں کا سہرا ہے اور وہ عورت کے جسم کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ عورت کھڑکی سے باہر دیکھ رہی ہے۔ ٹیالی چاندنی کے گرد انجن کا دھواں رقص کرتا ہوا پیچھے کی جانب آسمان میں اُڑ رہا ہے۔ اور کبھی کبھی چاند روپوش ہو جاتا ہے۔ ڈبے میں نیچے تین برتھ ہیں۔ ایک پر مرد اور عورت دوسرے پر ٹنگن کی تلوار اور ہاتھی دانت کا سیندور کا ڈبہ اور تیسرے پر دو بچے اوندھے پڑے سو رہے ہیں۔ ڈبہ میں بجلی کا ایک ہی پنکھا چل رہا ہے۔)

عورت :- (دبی سی کراہ کے ساتھ) اوہ ......!

مرد :- (چونکتے ہوئے) کیوں کیا ہوا؟ (کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے)

چاند چھپ گیا ؟ لیکن آپ ٹکٹکی باندھے چاند کو کیوں دیکھ رہی ہیں ؟ کتنی
اندھیری رات ہے ۔ سنئے ، گرمی بہت زیادہ ہو رہی ہے ۔ دوسرا پنکھا بھی
کھول دوں ؟ بولئے !

(عورت ایک جھونکے کی طرح کروٹ بدلتی ہے ۔ ہاتھوں کی چوڑیوں سے
ایک مترنم صدا نکلتی ہے ۔ مرد کی نگاہیں اُس کی عریاں بانہوں پر
گڑ جاتی ہیں)

مرد :۔ گرمی بہت زیادہ ہے ۔ آپ چادر ہٹا دیجئے نا !

(عورت رنگین چادر الگ کر دیتی ہے ۔ جیسے وہ اس کے کہنے ہی کا
انتظار کر رہی تھی ۔ اُس کی جبیں پر تارے لرز رہے ہیں ۔ پلکیں نیم وا
ہیں ۔ حنا آلود ہاتھ آنچل کو سنبھالے ہوئے ہیں ۔)

مرد : (اُس کے پاس لیٹتے ہوئے) کتنا خوبصورت ماحول ہے ۔ بالکل ایک ہلکے
شیریں گیت کی طرح ـــ بہار کا ـــ چمن زار کا ۔

عورت : کچھ کہا آپ نے ؟

مرد : جی ، یہی کہ ہم اتنے نزدیک بیٹھے ہوئے کتنے اچھے لگ رہے ہیں ۔ ؟ کتنے
مانوس ، کتنے خوب صورت ـــ میرے دل میں ایک سوتا ہوا نغمہ انگڑائیاں
لے رہا ہے ۔ کاش تم اپنے چہرہ سے آنچل ہٹا لیتیں !

عورت (ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ) اوہ ـــ ......!

مرد :۔ یہ کیا ہو گیا آپ کو ؟ میں نے کہا تھا باہر نہ دیکھتی رہئے ۔ باہر کیا دھرا ہے ؟
اس پھیکی چاندنی کے سوا ـــ جو چٹانوں پر رقص کر رہی ہے ۔

عورت :- جی، بہت پیاس لگی ہے۔ بہت پیاس لگی ہے۔ آہ!

(مرد اُٹھ کر عورت کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ عورت کے شبنم آلود لبوں سے بے ربط سانسیں نکل رہی ہیں۔ عورت گھبرا رہی ہے۔ مرد اُس کی چوڑیوں سے کھیلنے لگتا ہے)

عورت :- اوہ! ٹوٹ جائیں گی۔ سہاگ کے پہلے دن۔......

(مرد گھبرا کر اُس کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے)

عورت :- ارے آپ تو کانپ رہے ہیں — اس شدت کی گرمی میں ابھی تک آپ سر پر یہ بوجھ لادے ہیں۔ اسے اُتار کر رکھ دیجئے نا!

مرد :- یہ سہرا؟ یہ تو زندگی کا سب سے بڑا بوجھ ہے۔ اسے کیسے اُتار سکتا ہوں؟ تم نہیں جانتیں۔ دلہن کو آج یہ تاج اُتارنے کے لئے نہ کہنا چاہیئے۔ اور چوڑیوں کے ٹوٹنے کی بات بھی نہ کرنی چاہیئے۔ یہ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اُس کا سہاگ —......

عورت :- (چیختے ہوئے اُس کی آواز کو دبانے کے لئے) چپ —.... چپ رہئے دیوتا! اُف آج ہی کے دن یہ میں کیا سُن رہی ہوں؟ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں آپ؟

مرد :- ڈر گئیں تم؟ یہ تو ایک روایت ہے جو قدیم سے چلی آئی ہے۔

(خاموشی)

(پھر مرد کہتا ہے) اور تم تو حسن کی ملکہ ہو، رانی ہو، تم اتنی خوب صورت ہو— خوب صورت عورت تو مغرور ہوا کرتی ہے۔ تم ایک مرد کے

لئے کیوں گھبرا گئیں۔ اپنے شفاف بلور کی طرح جسم سے میرے سینے کی جلن مٹا دو — عورت، عورت — گیت گاؤ گیت — آمِ صبح کے۔ بہاروں کے، آبشاروں کے، اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو تا کہ اس کی گرمی سے میں پگھل جاؤں۔ لیکن خدا کے لئے تم میرے لئے غم نہ کرو — ایک مرد کے لئے غم نہ کرو۔ میں تو ہمیشہ سے ضبط کرتا آیا ہوں۔ لیکن میں ایک حسین اور مغرور عورت کی غم کھانے کی شکست برداشت نہیں کر سکتا۔

(عورت باہر چاند کے زرد زرد چہرے کو اور پھر مرد کے تمتمائے ہوئے چہرے کو دیکھتی ہے)

مرد: اُف! تمہاری یہ آنکھیں، آکاش کے تاروں کے دیپک — خدا کے لئے، خدا کے لئے — ......

عورت: مجھے خوب صورت کہہ کر میری قیمت نہ لگائیے دیوتا! میری قیمت، میرے عورت پنے کی قیمت، میرے کنوار پنے کی قیمت، میری مقدس روح کی قیمت، میرے گلنار ہونٹوں اور گھنے ابروؤں کی وجہ سے نہیں — میرے دل میں ایک اچھوتا گیت ہے، میری روح میں ایک انمول، اچھوتا نغمہ ہے۔ اُسے سنئے۔ میرا اپمان نہ کیجئے دیوتا!

مرد: تم کتنی خوب صورت ہو۔ تمہارا شباب آگ کی طرح تند ہے۔ تمہارے جسم میں ایک انوکھی لذت ہے۔ اُف! میں کانپ رہا ہوں۔ مجھ پر ایک کمزوری طاری ہو رہی ہے۔ مجھے اپنے آپ میں چھپا لو۔ مجھے اپنے آغوش میں لے لو۔

عورت :- آپ میری قیمت لگا رہے ہیں ؟

مرد :- نہیں ۔ تم تو میری ہو، میں تمہارے حسن کا پرستار ہوں۔ تم ایک حسین شعاع ہو۔

عورت :- مجھے اتنی خوب صورت کہہ رہے ہیں آپ ؟ مجھے، مجھے ......

مرد :- تم ایک دلکش نغمہ ، ایک سہانا گیت ہو ۔۔ تم مجھے غلط نہ سمجھو ۔ میں بھی تمہارا بن کے رہوں گا۔ مجھے اپنا جسم چھونے دو، میں تم سے محبت کرتا ہوں۔

عورت :- نہیں ۔۔۔ آپ میرے حسن کے ہیں، میری اُٹھتی ہوئی جوانی کے ہیں۔ آپ میرے نہیں، آپ میرے نہیں ۔ .....

مرد :- میں تمہارا ہوں، مجھے سمجھنے میں غلطی مت کرو۔ تم حسین ہو اپنے لئے اور میرے لئے ۔ اپنی دنیا کے لئے ، اور میری دنیا کے لئے، اپنی کائنات کے لئے ، اور میری کائنات کے لئے ۔۔۔ تم خوب صورت ہو، میری راتوں کو جھکانے کے لئے ، میرے دل کی خوب صورتی کے لئے ۔۔۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں ؟

عورت :- مجھے کچھ نہیں چاہئے ۔۔ اف ! آپ کے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہوئی جا رہی ہے ۔ میری چوڑی ٹوٹ گئی ۔ ایک، دو ۔۔۔ چھوڑیئے۔ چھوڑیئے ۔ میرے سہاگ کی نشانی ۔۔۔۔ (سسکتے ہوئے) کیونکہ میں بکی ہوئی ہوں اس حسن کی قیمت پر ! میری آواز، میری لے، میرا ساز، میری دھڑکن، میری آرزو، میری تمنا، میری خواہش، سب بکی ہیں ۔ کیونکہ مجھے میرے والدین نے آپ کے ہاتھ بیچ دیا ہے ۔ چند رسموں کی ادائیگی کے بعد آپ میرے مالک بن گئے ہیں۔

لیکن آپ نے میری قیمت لگانے میں دھوکا کھایا۔ آپ نے میری خواہش کو نہ سمجھا
میرے خوابوں کو نہ محسوس کیا۔ آپ نے میرے رنگ محلوں کو اپنی نفسانی
خواہشات کے بوجھ تلے داب دیا۔ اب وہ کھنڈر ہیں۔ اب میں کچھ نہیں رہ گئی۔
ایک مرد کی عورت ہوں، میں ایک حیوان کی خواہش ہوں۔ میں خواہش نہیں
کائنات کا خوفناک کھلونا ہوں —— میں کچھ نہیں ہوں اور میری روح کا
کچلا ہوا مقدس گیت بھی کچھ نہیں ہے۔ سب جھوٹ ہے، سب جھوٹ ہے ——.....

مرد :- تم بہت گھبرا رہی ہو۔ یہ زندگی ان ہی خیالوں میں ڈوبتی ابھرتی اپنی منزل
طے کرتی ہے۔ لیکن تم جو یوں مجھے آملی ہو۔ تم سچ مچ بہت خوب صورت ہو
تم اپسرا ہو —— تمہارے ہونٹ گلنار ہیں تمہاری آنکھیں آکاش کے
تاروں کے دیپک ہیں۔ میرے بھاگ جاگے ہیں جو تم مجھے ملی ہو ——
میرے پاس کھسک آؤ —— میرے قریب —— اور قریب
——.......

عورت :- اُفوہ !- چھوڑیے ـ ..... چھوڑیے ـ .....

(عورت چیخ اٹھتی ہے۔ مرد اپنے سر سے پھولوں کا وہ تاج پٹک
دیتا ہے۔ گاڑی کے فرش پر پھول ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔ عورت
لپک کر اپنے سیندور کے ڈبہ کو اٹھا لیتی ہے اور آنچل میں چھپا
لیتی ہے۔

(مرد یک بہ یک اُس کی طرف جھپٹتا ہے)

ہونٹوں کی کلیاں

[پہلی قضا]

(۱)

ساز بجتے رہے۔ ساز ناچتے رہے۔

"ڈارلنگ"

"ہُم"

"تم آج بے حد خوب صورت نظر آ رہی ہو"

مسکراہٹ

"بے حد خوب صورت۔ تمہارے یہ بال۔ یہ آنکھیں۔ یہ ہونٹ۔ یہ جسم ـــــ تم آج غضب ڈھا رہی ہو ـــــ ! تمہارے لمس سے میرا دل کانپ رہا ہے تمہارے ساتھ ناچتے ہوئے مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں ـــــ کہ میں۔ ......"

"کہ آپ ؟" حیا آلود شرارت

"کہ میں ہوا کے پروں پر اُڑ رہا ہوں ـــــ تمہارا کیا خیال ہے ؟"

"آپ بے حد شریر ہیں" !

"شریر نہیں ڈارلنگ ـــــ شریر نہیں۔ سچ مچ آج کی رات بے حد

خوب صورت ہے۔ ایسی رات کا میں مدتوں سے منتظر تھا۔ ایسی جادوانی رات ـــ ...... یہ تھرکتے ہوئے ساز، یہ موسیقی کی لے کیساتھ اٹھتے ڈگمگاتے قدم، یہ ہلکی نیلی روشنی، یہ اندھیرے اُجالے کی کیفیت۔ یہ دلوں کی بے ہنگم دھڑکنیں۔ مجھے ایسی راتوں سے ہمیشہ محبت رہی ہے ـــ یہ راتیں جب انسان لمحوں سے دور ایک اجنبی ماحول میں محلول ہوجاتا ہے۔ جب جسم ہلکے ہلکے سلگنے لگتا ہے۔ جب دل ان ہونی آشاؤں کے ہلکوروں سے ناچتا رہتا ہے ـــ جب دنیا جوان ہوجاتی ہے ـــ جوانی کے یہ دن لوٹ کے نہیں آیا کرتے ڈارلنگ ـــ ......"

ساز۔ دھڑکنیں۔ ساز۔ ہلکی ہلکی ہنسیاں۔

"روشنی نیم دائروں کی صورت میں ناچ رہی ہے"!

"ہُم" رعونت

"تم بہت خوب صورت ناچتی ہو۔ تمہارا ہر اگلا قدم ایک نئی ادا کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ ادا۔ ناز۔ مجسم ناز۔ اتنا خوب صورت ناچنا تم نے کہاں سے سیکھا؟"

"آپ بنا رہے ہیں!" حیا

"نہیں۔ تمہارا جسم خوب صورت اداؤں سے لپٹا ہوا ہے۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تمہارے جسم پر یہ ریشمی ملبوس بے حد نکھر رہا ہے۔ تمہارے کانوں کے یہ آویزے۔ تمہاری گردن کا یہ ہار۔ تمہاری نزدیکی کے احساس سے میرے ہونٹ کانپ رہے ہیں ـــ ڈارلنگ۔"

"آپ بہکنے لگے۔ میں اسی لئے تو آپ کے ساتھ آنا نہیں چاہتی تھی ـــ

آپ کو اپنے جذبات پر بالکل اختیار نہیں ...... اپنے آپ کو سنبھالئے ..... آپ کے قدم غلط اٹھ رہے ہیں — ...... یہ آپ میرے چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھے کیوں دیکھ رہے ہیں؟— ..... افوہ! میری کمر کے گرد آپ کی گرفت کستی جا رہی ہے آپ کے بوٹ بار بار میرے قدموں کو کچل رہے ہیں —..... ذرا دور ہٹئے۔ کوئی دیکھ لے گا تو کیا کہے گا؟"

"کوئی دیکھ لے گا؟" ہنسی۔ بہکی ہنسی۔ وحشی ہنسی۔ "کون دیکھے گا؟ کسے ہوش ہے جو دیکھے گا؟ ڈارلنگ۔ مجھے مت روکو۔ مجھے مضبوطی سے تھامے رہو۔ میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ تمہاری تیز تیز سانسوں سے میرے جسم میں انبساط کی نئی لہریں دوڑ رہی ہیں — ناچتی رہو — تیز تیز ناچتی رہو — ..... میری ہم رقص! رکو نہیں۔ تھمو نہیں۔ ٹھہرو نہیں — یہی زندگی ہے۔ یہی زندگی ہے — ....."

(۳)

"تم ناراض ہو؟"

"ہاں — بے حد!"

"مگر میں کیا کرتا؟ اپنے آپ کو کیسے روکتا؟ میرے بس میں کیا ہے؟ — اتنی خوب صورت رات — میں پتھر تو نہیں۔ بے حس چٹان تو نہیں۔ آخر

انسان ہوں۔ آخر مرد ہوں۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتی ہو کہ میرے بھی جذبات ہیں۔ تم ایک مدت سے ان جذبات سے کھیلتی رہی ہو۔ تم نے کب مجھ کو سمجھنے کی کوشش کی ہے؟ تم تو ناراض ہونا جانتی ہو۔ روٹھنا جانتی ہو۔ تمہارے تو دل نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو تم ایسا نہ کرتیں۔ تم تو برف کی سل کی طرح یخ ہو۔ مگر میں کیا کروں میرا بھی تو کوئی علاج ہونا چاہیئے ۔۔۔"

ضبط ۔۔ بھینچے ہوئے ہونٹ ۔

"انور ۔ دیکھو تم وہاں دور جا کھڑے ہوئے ہو ۔ میرا یہ منشا نہیں تھا۔ مجھے تو صرف تمہاری دیوانگی پسند نہیں ۔ میں روٹھی کہاں ہوں؟ میری طرف دیکھو ۔ میرے قریب آؤ ۔ دیکھو تو میرے بھینچے ہوئے ہونٹوں پر تمہیں منانے کے لئے مسکراہٹ بکھر گئی ہے ۔ تمہیں یہ مسکراہٹ پسند ہے نا؟ اس سے تمھیں حیا بار کلیوں کی یاد آجاتی ہے نا؟ ۔۔۔ لو بھر لو اپنے دامن میں ان کلیوں کو ۔۔۔"

(وقفہ)

انتظار ۔ انتظار ۔۔

تم نہیں آؤ گے انور؟ میں منت کرتی ہوں ۔ مجھ پر ظلم مت ڈھاؤ ۔ تم نے ٹھیک کہا تھا ۔ آج کی رات واقعی بیحد خوبصورت ہے ۔ جادو انی ہے ۔ تم روٹھے ہوئے دور جا کھڑے ہو تو مجھے احساس ہو رہا ہے ۔ واقعی ایسی رات میں تنہا رہنا ظلم ہے ۔۔۔ ...... دیکھو یہ پائیں باغ ۔۔۔ ...... یہ جگہ جگہ پھولوں کے پودے ۔۔۔ ...... یہ گمبھیر سناٹا ۔۔۔ ...... اور اس سناٹے کو چیرتی ہوئی یہ آرکسٹرا کی آواز ۔۔۔ ...... اور یہ اونچے اونچے مینار ۔ اور یہ ہوٹل کی عظیم الشان عمارت ۔

اور یہ آسمان کا چاند ۔۔۔۔ انور ۔ تم سب دیکھ رہے ہو نا ؟ یہاں کتنا سکون ہے ! ابھی ابھی ہم بال روم میں تھے تو مجھے احساس ہو رہا تھا، ہم دونوں جیسے کسی اجنبی دیس میں آ داخل ہوئے ہیں ۔ (ہنسی) ۔ اجنبی دیس ۔ جہاں کے انوکھے طلسم نے تمھاری آنکھوں کو بند کر دیا تھا ۔ اور تم اتنے لوگوں کے درمیان میرے حسن اور میری محبت کی تحقیر اُڑانا چاہتے تھے ۔ تمھارے ہونٹ میرے قریب آ رہے تھے ۔ تمھاری آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی تھی ۔ تم کچھ اور چاہتے تھے ۔ ۔۔۔۔ تم کچھ اور چاہتے تھے ۔ اور وہاں اتنے سارے لوگ تمھاری دیوانگی کو دیکھ دیکھ کر آنکھوں کے کونوں سے مسکرا رہے تھے ۔ اور میرا جسم بے عزتی کے جذبات سے سلگ رہا تھا ۔ پھر میں نے تمھاری بازوؤں کی گرفت سے اپنا آپ چھڑا لیا ۔ اور یہاں چلی آئی ـــــ تم سُن رہے ہو ؟"

(طویل وقفہ ۔ گمبھیر سناٹا ۔ آرکسٹرا کی لہریں)

"تو تم نہیں آؤ گے ؟ تم میرا مذاق اُڑانے پر تُل گئے ہو ۔ میں کہتی ہوں اگر میں نے تمھیں نہیں سمجھا تو تم نے کب میرے دل کو ٹٹول کر دیکھا ہے ؟ تم اب بے حس پتھر کی طرح وہاں کیوں سلگ رہے ہو ؟ تم کیوں میرے جذبات کا مذاق اُڑا رہے ہو ؟ ـــــ انور ـــــ انور ۔ میرا دل کانپ رہا ہے انور ۔ یہ بہت نازک ہے ـــــ یہ اپنی بے عزتی برداشت کرنے کا عادی نہیں ہے انور ۔ انور ۔ (آہستگی) سُن رہے ہو ؟ (آنسوؤں سے بھیگی آواز) سن رہے ہو ؟ ۔ تو تم مجھے یہاں لائے ہی کیوں تھے ؟ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم میری محبت سے

یوں کھیلو گے ـــ (آنسو) تم اتنے سنگدل ہو مجھے احساس نہ تھا (ہچکیاں) تم میرا دل توڑنا چاہتے ہو۔ تو یوں ہی سہی ۔ میں جا رہی ہوں ــ مجھے جانا چاہیئے ـ" آنسو ـــ آنسو ـ

وہ چلنے لگی ۔ وہ اُس کے پاس سے ہو کر گزری ۔ جیسے ہوا کا جھونکا پھولوں کی شاخ کو چھو کر گزر جائے ـ

"شمی!" وہ بے قرار ہو کر اس کی طرف لپکا ۔ "شمی ۔ رک جاؤ ۔ تم نہیں جا سکتیں شمی ـــ" وہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا ...... اُس کو کندھوں سے پکڑ کر ـــ "تم نہیں جا سکتیں شمی ـــ تم نہیں جا سکتیں ـــ"

"مجھے چھوڑ دو انور ـــ" سسکیاں ـ سسکیاں ـ

"نہیں شمی ۔ نہیں ۔ لوٹ آؤ ۔ آؤ ۔ پھولوں کے ان پودوں کے قریب واپس چلیں ۔ تم نے کہا تھا کہ تمھارے ہونٹوں پر حیا بار کلیاں کھل رہی ہیں ۔ میں لوٹ آیا ہوں ۔ بھرنے دو میرا دامن ان کلیوں سے ـــ مدتوں کے انتظار کے بعد یہ رات آئی ہے ۔ ہزار اصرار کے بعد تم پہلی مرتبہ یہاں آئی تھیں ـــ نہیں شمی نہیں ۔ ہم کبھی نہیں روٹھیں گے ـــ آؤ وعدہ کریں ۔ آؤ وعدہ کریں ـــ"

× × × × ×

[دوسری فضا]

(۱)

"ہوٹل ڈی پیرس" کے سازوں سے دور۔ آخیر شب تاروں کی چھاؤں میں ——— دبیز سناٹا۔ اردگرد اندھیرا۔ لمبی کوٹھی کے پچھواڑے ......

"شمی" لاابالی پن

قدموں کی چاپ۔ بے نور چاند کی روشنی میں سرکتا ہوا ایک پیکر —

"شمی" — تم نے کتنی دیر لگا دی۔" گلے۔ شکوے

سکوت

"تم نے کتنی دیر لگا دی۔ میں دو گھنٹوں سے یہاں انتظار کر رہا ہوں۔ ایسا تو آج تک کبھی نہ ہوا تھا۔ دیکھو تو۔ کتنا اندھیرا ہے؟ صبح ہونے والی ہے۔ اب میں مایوس ہو چلا تھا۔ اُفوہ! ...... آج کی رات — ...... شمی! تم بولتی کیوں نہیں؟"

سکوت!

"تم چپ ہی رہوگی؟ تمہاری خاموشی مجھے بار بار خوف زدہ کر دیتی ہے اور آج کی رات — ...... جب میں یہاں آیا تو چاند نصف آسمان میں تھا۔ پھر میں اسے سفر کرتے دیکھتا رہا۔ اس کا سفر کٹتا گیا مگر میرا انتظار ختم نہ ہوا۔ چاند کی روشنی کم ہوتی گئی اور میرے دل کے اندھیرے بڑھتے گئے۔ آج مجھے احساس ہوا کہ کسی کا اتنا طویل انتظار کتنا اذیت بخش ہے؟ ایک ایک لمحہ تمہارا انتظار تھا۔

پتہ کھڑکا اور میں چونک پڑا۔ میرے دیکھتے دیکھتے یہ ستارے ٹمٹمائے اور ڈوبنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ پھر میں نے سوچا اب تم نہیں آؤ گی۔ تم نرم گدیلوں کی طرح بستر پر محو خواب ہو گی۔ اور میں یہاں انتظار کی زحمتیں برداشت کر رہا ہوں۔ پھر میں نے سوچا۔ اب میں تم سے کبھی نہ بولوں گا۔ تم کس قدر ظالم ہو؟ کس قدر ـــ ......

سسکی۔

"شمی!" وہ چونک پڑا۔ "شمی یہ کیا؟ یہ سسکی کیسی؟ رات کے اس ویران سناٹے میں تمھاری سسکی میری روح کی انتہائی گہرائیوں میں اُتر گئی ہے"۔

وہ اس کے نزدیک آ گیا۔ "شمی! کیا بات ہے! کیا بات ہے؟"

خاموشی ـــ دبی دبی ہچکیاں۔

"تم رو رہی ہو۔ تم رو رہی ہو شمی؟ یہ کیا؟ یہ کیا؟ یہ کیا پاگل پن ہے؟ رات کے اس سکوت میں ـــ اتنی مدت بعد میں آیا ہوں ـــ ... اتنے ارمان لیکر ـــ ..... آخر کیا ہوا ہے؟ آخر کیا بات ہے؟"

وہ روتی ہی رہی۔ روتی رہی۔

"شمی۔ شمی" وہ اسے دلاسے دیتا رہا۔

پھر وہ اس کے قریب آ گیا۔ بہت قریب آ گیا۔ اُس نے اُس کے روتے جسم کے گرد اپنے بازو حمائل کر دیے۔ اور اُس کا سر اپنے شانہ کے ساتھ لگا کر اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"تم کہاں چلے گئے تھے؟ ـــــ بالآخر اُس نے کہا۔ افسودل سے
سُر اور آواز۔ "تم کہاں چلے گئے تھے؟ کہاں رہے اتنے دن"؟
"شمی، خدا کے لئے اب چپ ہو جاؤ۔ آج رات ہم ایک مدت کے بعد
ل رہے ہیں۔ آج رات میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میرے دل میں
تمھیں بتانے کے لئے لاکھوں طوفان بھرے پڑے ہیں۔ میرا دل بے قرار ہے۔
میں ـــ میں تمہیں سامنے بٹھا کر ـــــ ....."
"اب کہنے سننے کے لئے رہ ہی کیا گیا ہے!"
"شمی" اُس کا دل لرزنے لگا۔ "شمی۔ یہ کیا کہہ رہی ہو؟ میرے، دل
کے لاکھوں گیت ـــ میرے ہزاروں سپنے، میرے ارمان ـــ....."
"انور ـــ" اُس نے اپنا آپ چھڑا لیا۔ "انور" وہ اُس کے چہرے کو
دیکھنے لگی ـــ رونے لگی ـــ سسکنے لگی۔
"کیا بات ہے؟ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟ آج یہ کیسی پہیلیاں بجھا رہی ہو شمی
ـــ شمی میرا دل کانپ رہا ہے۔ خدا کے لئے کہو ـــ کیا بات ہے؟ کیا
بات ہے؟" بے قراری۔
"مجھے بھول جاؤ۔ مجھے بھول جاؤ انور ـــ" گیت سسک پڑے۔
"شمی" وہ چیخ اُٹھا۔ "تمھیں بھول جاؤں؟"
"ہاں! مجھے بھول جاؤ۔ مجھے بھول جانا ہی بہتر ہے۔ ان ہاتھوں کو دیکھتے
ہو ـــ؟"
"مہندی"؟ جیسے ہزاروں بچھوؤں نے اُسے ڈنک مار دیا ہو۔

"ہاں مہندی! تمہارے پیچھے میری منگنی کر دی گئی ہے۔ میرے والدین نے مجھے کسی اور کے حوالے کر دیا ہے۔ اب۔ اب۔ ......"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" دیوانگی ــ "یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں یہ کبھی نہ ہونے دوں گا۔ تم میری ہو۔ تم میری ہو۔ تم ساری کی ساری میری ہو۔ تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ تمہیں۔ تم۔ تم۔ ......"

"انجم" آنسو

"نہیں شمی! یہ غلط ہے۔ تم میرے خوابوں کی تعبیر ہو! مجھ سے میری زندگی بھر کی کمائی کوئی نہیں چھین سکتا۔ میں تمہارے لئے سارے زمانہ سے لڑوں گا۔ سارے زمانہ سے ــ ......"

"تمہارے جانے پر یہ سب ہوا۔ (آنسو) امی کو شاید اسی کا انتظار تھا۔ تمہارے جاتے ہی ــ ......"

"مگر تم؟ تم کیوں خاموشی سے سب کچھ دیکھتی رہیں؟ تم نے اس بات کو کیسے منظور کر لیا؟ تم نے تو مجھ سے وعدے کئے تھے۔ تم نے یہ مہندی کیسے اپنے ہاتھوں پر رچالی۔ تم۔ تم۔ ......"

"میں کیا کر سکتی ہوں ــ ایک مجبور عورت ــ تم سمجھتے ہو میں نے چپ چاپ یہ سب سہہ لیا؟ مگر امی ــ امی کو میری کوئی بات پسند نہیں ــ نہ میری تعلیم۔ نہ میرا لباس۔ نہ میری آزاد خیالی۔ نہ میرا تنہا بازار جانا ــ نہ میرا موٹر میں گھومنا ــ حتیٰ کہ ابا جان کے ساتھ کلب جانا بھی ــ تم جانتے ہو وہ کس قدر مذہب پرست اور پرانے زمانہ کی عورت ہیں۔ جونہی میں نے

زبان کھولی۔ مجھے ہزار گالیاں دی گئیں۔ اس نے نہ جانے مجھے کیا کیا کہہ ڈالا۔ میں چپ ہوگئی — وہاں سنتا ہی کون تھا؟ جسے اکر ابا جان تھی — سفصوران کا بھی کوئی غیر نہیں ——— میں کیا کروں؟ میں کہاں جاؤں؟ آنسو۔ آنسو۔

(۲)

شادی کے ہنگامے۔ مردوں اور عورتوں کے ہجوم۔ دروازے پر شہنائی — مٹھائیوں کے ڈھیر —— مہمانوں کا شور

"دلہن" وہ اُس کے سامنے جاکھڑا ہوا۔

گہنوں اور کپڑوں سے لدی ہوئی خوب صورت عورت اُٹھ کھڑی ہوئی — پرحجاب۔

"آخری سلام کہنے آیا ہوں!"

آنسو آنسو۔

"تم کتنی خوب صورت نظر آرہی ہو؟ تمہارا یہ ملبوس۔ یہ آراستہ بال۔ یہ مہندی سے رچے پاؤں، یہ شرم آلود جھکی پلکیں۔ یہ گہنے۔ تم۔ تم۔ .....

"انور" وہ بھبھک پڑی

"میں آخری بار ــــ آخری بار معافی مانگنے آیا ہوں ۔ تم آج نئے دیس جا رہی ہو ۔ مجھے معاف کرتی جاؤ ــــــ"!

"معافی"؟ آنسو یا ہچکی ؟

"ہاں ! تم نے ٹھیک کہا تھا ۔ غلطی پر میں تھا ۔ اور روٹھا بھی میں ہی رہا ۔ میں نے کتنا قصور کیا ؟ میں نے کہا تھا آؤ بھاگ چلیں ۔ میں نے کتنی گری ہوئی بات سوچی تھی ؟ میری آنکھیں تمہیں ترغیب دے رہی تھیں ۔ میں تمہیں اُکسا رہا تھا ۔ میں تمہیں ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا ۔ میں تمہاری کمزوری سے فائدہ اُٹھانا چاہتا تھا ۔ مگر تم میری بات سنکر جہاں کھڑی تھیں ۔ وہیں بیٹھ گئی تھیں ۔ تم نے روتے ہوئے کہا تھا "یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟" میں نے کہا تھا ــ "ہو کیوں نہیں سکتا ۔ کیا تمھیں مجھ سے محبت نہیں ؟ کیا ہم ایک دوسرے کو والہانہ نہیں چاہتے ؟ کیا ہم ایک دوسرے کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا وعدہ نہیں کر چکے ؟ تم رونے لگی تھیں ۔ میں نے کہا تھا عورت کمزور اور بزدل ہوتی ہے ۔ میں نے تمہیں ہاتھ سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تھا ۔ مگر تم نے انکار کر دیا تھا ۔ تمہیں اپنے والدین اور اپنے خاندان کی عزت کا خیال تھا ۔ پھر غصے میں آ کر میں نے تمھیں گالیاں دی تھیں اور برا بھلا کہا تھا اور روٹھ کر چلا آیا تھا ۔ اور تم روتی رہی تھیں ۔ روتی رہی تھیں ــ ......"

"انور ــــ انور ــــ" اور وہ زور زور سے رونے لگی ۔ اور باہر شہنائی بھی اور زور سے رونے لگی ۔ اور کہیں پرے کسی نے بابل چھیڑ دی "انور ــــ انور ــــ" اُس کے گرد آنسو اکٹھے ہو گئے ۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں ۔ اور اُسے

محسوس ہوا اُس کا سر ناچ رہا ہے۔ گھوم رہا ہے۔ اب وہ کھڑی نہ رہ سکے گی۔

"انور۔ انور۔ مجھے تھام لو ـــ مجھے سہارا دو ـــ"

مگر انور وہاں کہاں تھا؟ وہ تو بہت دیر کا وہاں سے جا چکا تھا۔ اپنے جذبات اور غم اور درد اور تڑپ کو برداشت نہ کر سکتے ہوئے وہ بگولے کی سی تیزی سے اس کمرے سے رخصت ہو چکا تھا۔

اور باہر بابل کے گیت دل کے آنسوؤں کے ساتھ رو رہے تھے!

تیسری فضا

(۱)

شمی آئی تھی۔ منصور بھی آیا تھا۔ دونوں شادی کے بعد پہلی مرتبہ آئے تھے۔ کتنی مدت سے شمی کو نہیں دیکھا؟ شاید ایک برس ـــ یا اس سے بھی زیادہ ـــ اور اب تو دل کے زخم کچھ بھر سے گئے ہیں۔ اسے شمی کو دیکھنا چاہیئے یا نہیں؟ کہیں پھر وہ زخم ہرے تو نہ ہو جائیں گے؟ کتنی مشکل سے اُس نے اپنے اوپر قابو پایا ہے؟ پہلے چند روز تو زندگی اور موت کے دوراہے پر لٹکا رہا۔ پھر جب وہ اچھا ہو گیا تو زندگی کی ہر دلچسپی سے مونہہ موڑ لیا۔ ایک ننھے دیے کی طرح بجھا بجھا رہنے لگا۔

اسکی زندگی کتنی تاریک تھی! روشنی کی ایک شعاع بھی تو میسر نہ تھی۔
مگر اس سے نہ رہا گیا۔ وہ شمی کو دیکھنے چل پڑا۔
وہ شمی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔
"آپ"؟
"تم؟ شمی؟" وہ اسے ایک ٹک دیکھنے لگا۔ وہ اُسے پہچان نہ سکا۔ یہ شمی کو کیا ہو گیا ہے؟ اتنی کمزور — اتنی دبلی — کہاں گیا اس کا وہ بے پناہ حسن —؟ کہاں گئیں اُس کے ہونٹوں کی حیا بار کلیاں —؟ اس کا سر گھومنے لگا۔ اُس نے ایک مینار کا سہارا لیا۔
شمی کی آنکھیں بجھی بجھی تھیں!
شمی کا جسم ایک ویران بہار بن گیا تھا۔
شمی کے ہونٹ بے رس۔ بے نور اور اُداس تھے۔
شمی میلے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اس کے بال اُلجھے اُلجھے تھے۔
"شمی! شمی!" اُس کا دل چیخ اُٹھا "یہ کیا ہوا؟ یہ تمہارے ساتھ کیا ہوا؟ یہ اتنا ظلم کس نے ڈھایا؟ اس چھوٹی سی عمر میں تم سے تمہاری ہنسیاں کس نے چھین لیں؟ تمہارے ہونٹوں کی تابانی کہاں رخصت ہو گئی؟ یہ کیا ہو گیا؟ یہ قافلہ کیسے اُجڑ گیا؟"
مگر وہ اس سے کچھ نہ کہہ سکا۔ اور چپ چپ لوٹ آیا۔
پھر اُسے پتہ چلا کہ شمی خوش نہیں۔ اس کا خاوند جواری ہے۔ شرابی ہے آوارہ ہے۔ کوئی کام نہیں کرتا۔ وہ شمی کو اپنی لونڈی سمجھتا ہے۔ وہ اُس کا تمام

زیور بیچ کر کھا گیا ہے۔ وہ کئی کئی راتیں گھر نہیں لوٹتا۔ وہ اپنے والدین سے علیحدہ ہو چکا ہے۔ اس نے شمی کی زندگی کو اجیرن کر رکھا ہے۔

اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔

کئی دنوں کے انتظار کے بعد وہ پھر شمی کے ہاں گیا۔ شمی اُس کے سامنے آگئی اور تب یکبارگی وہ چونک پڑا۔ اسے احساس ہوا جیسے اُسے دیکھ کر شمی کی آنکھیں چمک اُٹھی ہوں ـــــ .... وہ سوچنے لگا۔ وہ سوچتا رہا ـــــ کیا شمی کے دل میں ابھی تک اُس کی یاد ہے؟ کیا شمی اُسے بھولی نہیں؟ کیا اب بھی وہ اُس کے کسی کام آسکتا ہے؟

ایک بار پھر اُس کے خوابوں کی دنیا آباد ہونے لگی۔

وہ شمی کے ہاں اکثر جانے لگا۔ گھنٹوں بیٹھنے لگا۔ اُس نے منصور کو اپنا دوست بنا لیا۔ وہ اُس کی پیسوں سے امداد کرنے لگا۔ منصور اُس کا احسان مند رہنے لگا۔

اور اُسے محسوس ہونے لگا۔ ایک بار پھر وہ پرانے دن لوٹ آئے ہیں۔

شمی اب اُس کی نگاہوں سے جھینپتی نہیں۔ شمی کی نگاہیں پھر سے حیا بار ہونے لگی ہیں۔ اُس کے ہونٹوں کی تابانی لوٹنے لگی ہے۔ لوٹنے لگی ہے اور وہ پھر وہی پرانی شمی بننے لگی ہے۔ اس کے جسم کے گرد پھر سے ادائیں لپٹنے لگی ہیں۔ پھولوں پر پھر سے نکھار آنے لگا ہے ـــــ ....

ـــــ پھر منصور چلا گیا۔ شمی اور وہ اسے اسٹیشن پر چھوڑنے آئے .... جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا وہ شمی کی طرف مڑا اور اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ بھی جھینپی جھینپی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہی تھی!

وہ دونوں اسٹیشن کی عمارت سے باہر آ گئے۔ باہر آتے ہوئے اُس نے پہلی بار اُس کی طرف بھرپور نگاہوں سے دیکھا۔ دبلا پتلا جسم۔ نہایت ہی معمولی قسم کے کپڑوں میں لپٹا ہوا۔ سر۔ بال۔ کان آنچل میں چھپے ہوئے۔ آنکھیں دور کہیں تکتی ہوئیں۔ افوہ! یہ شمی۔ اور ایک سال پہلے کی شمی .... وہ دونوں کا موازنہ کرنے لگا۔ کہاں گئی وہ شمی؟ یہ شمی کون سی ہے؟ اس کا دل جلانے لگا۔

وہ اسے لے کر "کینفے ڈی روز" آ گیا۔ شمی نے ایک لفظ تک نہ کہا۔ سہمی سہمی ہرنی کی طرح اُس کے پیچھے آتی گئی۔ "کیبن" میں بیٹھنے کے بعد یکایک اُسے محسوس ہوا کہ اُس کا پہلا خیال غلط تھا۔ یہ وہی شمی ہے۔ ابھی تک اُس کے جسم کے ساتھ وہی مانوس بُو۔ وہی لطافتیں لپٹی ہوئی ہیں۔ ابھی تک اُس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اُس کا دل دھڑکتا ہے۔ ابھی تک اُس کے حسن میں وہی البیلا پن، وہی نکھار، وہی رعونت باقی ہے۔ ابھی تک اُس کے ہونٹوں پر کلیاں بکھرتی ہیں۔ ابھی تک —— ....

وہ اُسے دیکھتا رہا۔ اور وہ خاموشی سے چائے پیتی رہی۔

تب ناگاہ دل کے کسی کونے کھدرے سے ایک آواز نے سر اُٹھایا۔ "یہ تو غیر کی ہے۔ یہ تو شادی شدہ ہے۔ اس کے حسن کا جمال تو کسی اور نے لوٹ لیا ہے۔ تم بچی کھسوٹی ہڈی سے کیا لینے آئے ہو؟"

"نہیں۔ نہیں"۔ اس نے اپنے اس خیال کو جھٹلا دیا۔ "اس کو تو صرف شمی سے ہمدردی ہے۔ محض ہمدردی —— ....."

"ہمدردی؟" ذہن میں ایک قہقہہ اُبلا۔ "پھر تم اُس کے حسن اور اس حسن سے پیدا شدہ تاثرات کا کیوں تجزیہ لے رہے ہو۔ ؟ کیوں ؟ کیوں ؟"

وہ اس کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ چپ چاپ شمی کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اس کے احساسات سے بے خبر خاموشی سے چائے پی رہی تھی۔

باہر شام ڈھل رہی تھی۔ وہ باہر نکلے۔ اگلے موڑ پر ہوٹل ڈی پیرس، کے ساز سنائی دے رہے تھے۔ خوب صورت مرد اور عورتیں اندر باہر آجا رہی تھیں۔ حسین لباس۔ کھنکتے قہقہے۔ لاأبالی ہنسیاں۔ خوشیاں۔ ہنگامے۔

اُس نے شمی کیطرف دیکھا۔ اُس نے اُس کے چہرے پر جذبات کو ٹٹولا۔ وہ ابھی تک کہیں دور دیکھ رہی تھی!

وہ اُسے لے کر ہوٹل کی عمارت کی پچھلی جانب کے بائیں باغ میں آگیا۔ شمی چپ چاپ اس کے ساتھ چلی آئی۔

اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ اُس کے ذہن میں تمام پچھلی یادیں بکھر گئیں۔

"شمی" اُس نے کہا

شمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے پتھر کے بنچ پر بیٹھ گئی۔ اردگرد پھولوں کے لاتعداد پودے بکھرے ہوئے تھے۔ دور ہوٹل میں ساز کی آوازیں تیز ہوتی جا رہی تھیں

"شمی" وہ اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ "شمی! تمہیں کچھ یاد ہے؟ یہی وہ جگہ ہے جہاں تم شادی سے پہلے ایک روز میرے ساتھ آئی تھیں۔ ہم اندر بال روم میں گئے

تھے۔ تم میرے ساتھ ناچ رہی تھیں۔ ہم خاموشی سے ایک دوسرے کے دل کی دھڑکنیں محسوس کر رہے تھے۔ تب یکبارگی آرکسٹرا کی دھنیں بدل گئی تھیں اور "کس می ڈارلنگ" کے سروں نے دلوں میں آگ لگا دی تھی۔ تب تم میرے بہت قریب تھیں۔ تمھارا جسم میری بانہوں میں تھا۔ میرا دل جذبات کی حدت سے تپ رہا تھا۔ تمھاری کمر کے گرد میرا بازو لرز رہا تھا۔ تمھارے ہونٹ مدھم روشنی میں بے طرح چمک رہے تھے میں نے ان ہونٹوں کو چوم لینا چاہا تھا تب ۔۔۔ تب ۔۔۔ ...."

شمی اٹھ کھڑی ہوئی۔ شمی چلنے لگی۔ "شمی۔ شمی" وہ اُسے بلانے لگا۔ "شمی۔ شمی" ایک بار پہلے بھی ایسا ہوا تھا۔ ایک بار پہلے بھی شمی اس طرح روٹھ کر جا رہی تھی اُس نے اسے بلا لیا تھا۔

وہ اس کی طرف لپکا۔ "شمی شمی" وہ اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

تب ناگاہ اُس نے دیکھا کہ شمی رو رہی ہے۔ بے طرح رو رہی ہے

"چلو گھر چلیں" سسکیوں میں ڈوبی ہوئی ایک کمزور سی آواز نے کہا اور وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اسے چپ بھی نہ کرا سکا۔ ان آنسوؤں سے وہ ڈر گیا تھا۔ نہ جانے ان آنسوؤں میں کیا تھا۔ کون سا جذبہ تھا۔ کون سی کیفیت تھی۔ یہ آنسو اُن آنسوؤں سے مختلف تھے۔ اُن آنسوؤں میں گلے تھے۔ شکوے تھے۔ روٹھنے کے انداز تھے کسی کے منانے کا انتظار تھا۔ مگر ان آنسوؤں میں لٹی ہوئی حسرتوں اور برباد تمناؤں کے مزار تھے۔ وہ چپ چاپ اُس کے ساتھ باہر آ گیا۔

(۲)

مگر اُس کا دل سلگتا رہا۔ شمی کی نزدیکی کے احساس سے اُس کے جسم میں ہلکی ہلکی چنگاریاں پیدا ہوتی رہیں۔ ایک روز اُس نے ان ہونٹوں کو چومنا چاہا تھا۔ مگر شمی اپنا آپ چھڑا کر چلی آئی تھی۔ آج مدتوں کے بعد اُس نے ان ہونٹوں کو اور ان ہونٹوں کی رعنائیوں کو اپنے سامنے دیکھا ہے۔ اور اب یہ ہونٹ اُس کے ہیں۔ اب یہ ہونٹ ترغیب دے رہے ہیں۔ اب یہ ہونٹ ترسے ہیں۔

ارد گرد تنہائی تھی۔ اندھیرا تھا۔ شمی اس کے پہلو بہ پہلو چل رہی تھی۔ ایک زمانہ تھا جب یہ شمی اس سے بے اندازہ محبت کرتی تھی۔ پھر اُس نے سوچا تھا کہ ایک روز شمی کے ساتھ اُس کے جسم کی ساری رعنائیاں بھی اُس کی اپنی ملکیت ہو جائیں گی۔ مگر یہ نہ ہو سکا۔ وہ کسی اور کی بنا دی گئی۔

کسی اور کی؟ مگر وہ تو جواری ہے۔ شرابی ہے۔ اس نے تو اس کے مستقبل کو برباد کر دیا ہے۔ اُس نے اسے کوئی سکھ نہیں پہنچایا۔ شمی کو اس سے نفرت ہے۔ شدید نفرت ہے۔ اور یہ نفرت اُسکی آنکھوں سے بھی عیاں ہے۔ اور اُس کے جسم کی تشنہ آرزوں سے بھی ـــــ ....

اور ـــــ اور وہ ابھی تک اُس سے محبّت کرتی ہے۔ اسے دیکھ کر ابھی تک

اُس کی پلکیں حیا آلود ہو جاتی ہیں۔ اس کے چہرے پر تازگی آجاتی ہے۔ اُس نے اس کی نزدیکی سے کبھی انکار نہیں کیا۔ وہ کتنے بھروسے سے اُس کے ساتھ چل رہی ہے۔ اس تنہائی میں ——— ....

وہ یکبارگی راہ میں رک گیا۔ وہ اُس کے نزدیک ہو گیا ——— بہت نزدیک ——— اُس کی سانسیں اُلجھ گئیں۔ وہ منھ سے ایک لفظ تک نہ کہہ سکا۔ اور ہڑبڑا کر اُس سے لپٹ گیا۔

اور شمی کے ہونٹوں سے ایک ہلکی سی چیخ بلند ہوئی۔ "انور! ——— یہ کیا؟" اُس کی آواز میں سختی تھی۔ درشتی تھی!

"شمی۔ شمی" وہ جذبات کے ہاتھوں مغلوب ہوتا گیا "——— میں تم سے محبت کرتا ہوں بے حد محبت کرتا ہوں۔ میں تمھارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نہیں رہ سکتا۔"

شمی کے جسم نے احتجاج کیا۔ زبردست احتجاج کیا۔ وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح جدوجہد کرتی رہی۔ دانتوں سے۔ ہاتھوں سے۔ مکّوں سے۔ جھنجوں سے ——— وہ اپنا آپ چھڑاتی رہی

مگر وہ اُس سے لپٹا رہا۔ "شمی۔ شمی" آج مجھے مت روکو۔ آج مجھے ان ہونٹوں کی کلیاں چننے دو۔ میں مدتوں سے پیاسا ہوں۔ آج ہزاروں سالوں کے بعد یہ موقع آیا ہے۔ مجھے مت روکو۔ مجھے مت روکو۔"

وہ جدوجہد کرتی رہی "مجھے چھوڑ دو۔ مجھے چھوڑ دو۔"

وہ مضبوطی سے اُسے تھامے رہا۔ اُس نے اُن ہونٹوں کو چومنا چاہا۔ مگر وہ ہونٹ دور ہٹتے گئے۔ تب شمی کی مٹھیاں کس گئیں۔ ہونٹ بھینچ گئے۔ آنکھیں سلگ اُٹھیں۔

وہ حلق کی پوری قوتوں سے چیخ اٹھی ــــ "انور ــــ"

اور یہ چیخ انور کے اندر کی ساری طاقتوں سے ٹکرا گئی۔ وہ سہم گیا، عورت جاگ اُٹھی تھی۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ شمی نے اپنے آپ کو چھڑا لیا۔ اور ہانپنے لگی۔

"تم اتنے کمینے ہو مجھے علم نہ تھا۔" نفرت

"میں تم سے محبت کرتا ہوں شمی!"

"تم اسے محبت کہتے ہو؟ اس خود غرضی اور ہوس کو؟ تم محبت کے معنی بھی جانتے ہو؟ ایک پرائی عورت کے جسم سے لپٹنے کو محبت کہتے ہیں ــــ؟"

"پرائی عورت؟ تم منصور کا ذکر کر رہی ہو ــــ؟ (کھوکھلا قہقہہ) وہ تمھارا خاوند؟ وہ جواری؟ شرابی، آوارہ، رذیل انسان؟ ــــ وہ جو دوسروں کے ٹکڑوں پر پلتا ہے؟ وہ جس نے تمھارا یہ حال کر رکھا ہے؟ نہیں شمی نہیں ــــ وہ تمھارے قابل نہیں ــــ وہ ان ہونٹوں کو چھونے کا حقدار نہیں ــــ وہ ــــ ...."

"انور" وہ غرائی

"ہاں! وہ ان ہونٹوں کو چھونے کا حقدار نہیں۔ کیونکہ ــــ کیونکہ وہ بیچتا پھرتا ہے۔ تمھیں .... تمھارے ہونٹوں کو ــــ (تمتماتی آنکھیں)، ہاں اُس نے پیسے لئے ہیں ــــ مجھ سے! اور تم جانتی ہو۔ میں نے اُسے پیسے کیوں دئے؟ تمھارے لئے ــــ صرف تمھیں حاصل کرنے کے لئے ــــ میں نے اُسے پیسے دیے تاکہ وہ جوا کھیلے اور شراب پیئے۔ اور میں تمھیں حاصل کر لوں ــــ تم ــــ تم ــــ ...."

"انور صاحب ــــ زبان سنبھالئے ــــ انور صاحب ــــ" وہ غصے سے کانپنے لگی۔

"منصور ——— وہ غلیظ بدصورت مرد ——— ؟ نہیں، نہیں شمی۔ اُسے بھول جاؤ۔ اور یہ بھی بھول جاؤ کہ وہ تمہارا خاوند ہے۔ بھول جاؤ۔ دنیا کے رسم و رواج کو ——— آؤ بغاوت کریں۔"

"چپ رہو۔ دنیا کے سب سے رذیل انسان۔ میں تمھیں ایک بہتر مرد سمجھتی تھی۔ میں روح کی گہرائیوں میں تمھاری عزت کرتی تھی۔ مگر تمھارا یہ رخ دیکھنے کے بعد ——— وحشی ——— جنگلی۔"

وہ غصے سے بھنا اٹھی۔ "تم سمجھتے ہو میں کمزور عورت ہوں۔ اپنی حفاظت نہیں کر پاؤں گی؟ تمھارا یہ رخ دیکھنے کے بعد ——— تم ——— تم ———" وہ غصے کے مارے چپ ہو گئی۔

وہ ہنسنے لگا۔ "روٹھو نہیں۔ آؤ۔ آؤ شمی۔ ہم نے ایک روز وعدہ کیا تھا کہ کبھی نہیں روٹھیں گے۔ آؤ۔ میری آغوش میں۔ شمی آؤ ———" وہ اُس کی طرف بڑھا۔

"آگے مت بڑھو۔ آگے مت بڑھو۔" آواز تیز ہوتی گئی

وہ ہنستا رہا۔ "آج میں نہ رکوں گا۔ آج ——— ...."

اور تب ایک زناٹے دار تھپڑ اُس کے گالوں پر آ جڑا۔ اُس کا سر چکرا گیا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں۔ شمی اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ مجسم قہر ——— "تم نے عورت کی تقدیس کو کیا سمجھا ہے؟ ——— رذیل انسان ——— عورت بازاری جنس نہیں۔ آج میں سمجھ گئی کہ تم کیا ہو؟ آج مجھے پتہ چلا کہ تم اور تمھاری محبت سب خواب تھے۔ کہ میں تمھاری نگاہوں میں کیا ہوں؟ صرف ایک کھلونا ہی نا؟ چلے جاؤ ——— چلے جاؤ۔ اُف ——— تم نے مجھے غلط سمجھا ہے۔ چلے جاؤ کیونکہ مجھے تم سے نفرت ہے۔ بے حد نفرت ہے۔

میں تم اور تمھاری دولت پر تھوکتی ہوں۔ اور محبت ——— محبت مجھے منصور سے ہے۔ اُس کی تمام برائیوں کے باوجود ——— وہ تم سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ وہ میرا خدا ہے۔ تم نے سنا وہ میرا خدا ہے۔ اُس کی شان میں ایک لفظ بھی تم نے کہا تو اچھا نہ ہوگا۔!"

اور غصّے سے دندناتی ہوئی وہ چلی گئی۔ اور وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔ کچلے ہوئے پھول کی طرح ——— شمی کی اُنگلیوں کا احساس ابھی تک اُس کے گالوں پر باقی تھا۔ اور اس آواز کی بازگشت ابھی تک فضا میں گونج رہی تھی ———

"منصور میرا سب کچھ ہے — وہ میرا خدا ہے — تم اور تمھاری محبت سب خواب تھے۔ مجھے تم سے نفرت ہے — ..... نفرت ہے — .....!"

وہ جا رہی تھی۔ ایک گرتا پڑتا پیکر۔ رات کے دبیز اندھیروں میں محلول ہو رہا تھا ——— عورت کا تقدس!

اُس نے تلخی سے ہونٹ سکیڑ لئے۔ اور سڑک پر پڑے ایک آوارہ پتھر کو بوٹ کی ٹھوکر سے اُڑا دیا۔ اور ایک کنارے چلنے لگا!

دور کہیں "ہوٹل ڈی پیرس" کے ساز رقص کی گت پر بج رہے تھے!

جسم کی پکار

عجیب سی طبیعتیں پائی تھیں ان بھابھیوں نے بھی ——— جہاں کسی مرد کا ذکر آیا اور وہ چھوئی موئی سی بن گئیں ۔ گویا وہ عورتیں نہ ہوئیں شبنم کے پھول ہوئیں ——اب یہ بھی کوئی زندگی ہوئی ؟ باہر کی گھما گھمی سے وہ کس قدر دور تھیں ؟— روز چاند نکلتا ہے ۔ ٹھنڈی ہوا چلتی ہے ۔ تارے گنے جاتے ہیں ۔ شام کو آسمان پر مست مناظر بکھرتے ہیں ۔ مگر چاند اب کس قدر بیہودہ سا لگتا ہے بس دیکھتے جائیے اسے ——— نہ دیکھئے تو کیا ہی کیا جائے ——— آخر کس کے ساتھ بات کی جائے ؟— باہر کتنا حسن ہے ؟— یہ بوقلموں نظارے ۔ مردوں کی بے پرواہیاں ۔ موسیقی اور عشرت ——— اور اُس کے مقابلے میں گھر کی یہ محدود چہار دیواری ——— ! اونہہ ! اب کبھی کبھی کوئی سہیلی آ گئی تو دیواروں سے چند نسوانی قہقہے ٹکرائے ۔ ورنہ یوں سارے گھر پر ایک عجیب سا سکوت چھایا رہتا ہے ——— ایک ہولناک سا جمود ———

اور پھر فریدہ ——— جو جذبات کی رو میں بہت جلد بہہ جانے والی ایک رومانی لڑکی ہے ——— ایک اُداس اور مغموم شاعر بھی ہے ۔ جس کی آنکھیں کالی مدماتی گھٹا کی طرح ہیں ۔ جس کی مژگان کے نیچے جوانی کی نیند سوئی رہتی ہے ۔ اور جس کا جسم ایک بیقرار موج ہے ——— مردوں کو ایک عجیب و غریب چیز سمجھتی ہے ۔ ایک ایسی چیز

جو شباب کو ٹھوکروں سے اُڑائے ــ بے نیازسی ــ ایک ایسی چیز جو سمجھ سے باہر ہو ـ جو عورت کو گڑیا سمجھے ـ جو پرستش کے قابل ہو ـ

اب کبھی کبھی بھائی جان کے دوست باہر آجاتے ہیں تو گھر کی فضا میں ایک ہلچل سی مچ جاتی ہے ـ ساجدہ جس کے دولہا ابھی اُسے رخصت کرا کے نہیں لے گئے خود بخود مسکراتی رہتی ہے ـ نکی بھابھی بچوں کے جھرمٹ سے جان چھڑا کر اپنے ہاتھ سے پان بناتی ہے ـ حد تو یہ ہے کہ دق کی مریض بڑی بھابھی بھی اِدھر سے اُدھر ـ اُدھر سے اِدھر جیسے کوئی تلاش کرتی ہوئی پھرنے لگتی ہے ــــ وہاں بھائی جان کے وہ دوست جن کی بنیاں طوفانوں کی جولاگاہیں ہوتی ہیں، جن کی آوازوں میں سحر ہوتا ہے ـ اونچی آواز میں قہقہے لگاتے ہیں، تاش کھیلتے ہیں ـ گنگناتے ہیں، سرگوشیاں کرتے ہیں ـ دبے لہجہ میں لڑکیوں کے تذکرے کرتے ہیں ـ اور معنی خیز نظروں سے پردے کو دیکھتے ہیں ـ

اور ادھر فریدہ گھر والوں سے چھپ چھپ کر انہیں دیکھا کرتی ہے ـ ان کی بنیوں کو ـ ان کی مسکراتی آنکھوں کو ـ ان کے بلند قہقہوں کو ـ اور اُٹھتی نگاہوں کو ــــ

اور پھر کھردری چٹائی پر اوندھی لیٹ کر خوابوں کے جال بنتی ہے ــ وہ جان گئی ہے کہ لمبا منحنی سا عینک والا رفیق ہے ـ اور ڈھیلے پائنچوں کی شلوار والا انور ہے ـ چھریرے بدن والا خوب صورت سا لڑکا ـ جس کی آنکھوں کے پاس کی جگہ اُبھری ہوئی ہے، اُسے اشرف کہتے ہیں ـ اور "اے وحشتِ دل کیا کروں ـ اے غمِ دل کیا کروں" گانے والا اصغر ہے ـ جس کا مکان بالکل ملحق ہے ـ اور جو کسی کالج میں پڑھتا ہے چھت کے روشن دان سے وہ زمستان کی حسین راتوں کو اُس کی گنگناہٹ سنا کرتی ہے

اور لجایا کرتی ہے۔

بھائی جان کے دوست بھی عجیب عجیب اَن کہی باتیں کہہ دیتے ہیں اور اصغر کبھی کبھی ——————

غم کا بحرِ بیکراں ہے یہ جہاں
میری محبوبہ کا جسم اک ناؤ ہے۔
سطحِ شور انگیز پر اس کی رواں
ایک ساحل، ایک اَن جانے جزیرے کی طرف
اس کو آہستہ لئے جاتا ہوں میں

گنگنایا کرتا ہے۔ دروازے کے کواڑوں سے کبھی کبھی عشرت کے قہقہوں کے ساتھ اُس کا "میری جان" کہنا بھی سنائی دیتا ہے۔

فریدہ کے لئے باہر کی دنیا بڑی حسین ہے۔ آرزوؤں، تمناؤں اور دلکش سپنوں سے لبریز۔ لیکن اس کی اپنی دنیا تین کمروں اور دہلیز کی اس چوکھٹ تک ہی محدود ہے۔ کتنی مختصر ہے اس کی کائنات! جہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں۔ جہاں مرد کے نام سے کپکپانے والی عورتیں ہیں۔ جہاں کھل کر گنگنانے، زور سے ہنسنے دوڑنے اور ایسا کام کرنے کی جسے کرتے ہوئے نتھنوں پر پسینہ جھلملا اُٹھے، ممانعت ہے۔

یہ چھوٹے دولھا بھائی ابھی پڑھتے ہیں ۔ اور ساجدہ ابھی سسرال نہیں گئی ۔
ان کے کبھی کبھی آجانے سے فریدہ کو جیسے دفعتاً کوئی گم گشتہ سی بات یاد آجاتی ہے ۔
اُن کی آمد خاموشی میں طوفانوں کے غوغائے عظیم کی مترادف ہوا کرتی ہے ۔ وہ ہمیشہ
نئی اور عجیب باتیں کہتے ہیں ۔ یہ ورزشی جسم ، اتنی چھاتی ، ٹیڑھی فیلٹ ۔ منہ میں
سگرٹ اور پھر دھوئیں کے بے ہنگم مرغولے ۔۔۔۔

اب کے جب وہ گرمیوں کی چھٹی میں آئے تو بہار گزر چکی تھی ۔ اور لُو اور گرمی
کی وجہ سے دن مشکل سے کٹتا تھا ۔ فضا کا حسن مر چکا تھا ۔ مگر وہ جونہی آئے مطلع جیسے
چھٹ گیا ۔ بچے اُس کے ساتھ گھوڑا گھوڑا کھیلنے لگے ۔ ساجدہ کواڑ کی آڑوں سے اُسے
دیکھنے لگی ۔ اُن کے لااُبالی قہقہے ۔ سارا دن گھر کی فضاؤں میں دھڑکن پیدا کرتے رہے
اُن کا وجود اپنے ساتھ گئی گزری بہاروں کا حسن سمیٹ لایا ۔ جوانی کے خواب سمیٹ
لایا اور وہ جذبے لوٹا لایا ۔ جب آدمی چپکے چپکے آرزوئیں کرنے لگتا ہے ۔ اور دل چوری
چوری دھڑکتا ہے ۔

اور ایک بار پھر حسن جوان ہو گیا ۔ گھسٹتا ہوا وقت پر لگا کر اُڑنے لگا ۔ منجمد
سا سکوت منتشر ہو گیا ۔ اور ہر طرف بیقراری سی چھا گئی ۔ ذرہ ذرہ زیرِ لب مسکرانے لگا
اور چاند کی بے ہودگیاں ماتھے کا جھومر بن گئیں ۔ ہلکا ہلکا ، سنہری ، کپکپاتا ہوا حسین جھومر ۔

اور رنج منج ستارے پھولوں کی وادیاں بن گئے۔ اب رات رات بھر جاگ جاگ کر خواب دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ آسمان کی منقش چھت کی طرف منھ کرکے سینے پر ہاتھ رکھ کر عجیب عجیب باتیں سوچنے کو جی چاہتا ہے۔

اور مکان کے اس کونے سے اُس کونے تک اور اُس کونے سے اِس کونے تک دو شریر آنکھیں ہر وقت پیچھا کیا کرتی ہیں۔ اور ہر لمحہ یہ احساس رہتا ہے کہ کوئی اُٹھا کر آنکھوں میں بٹھا لے گا۔ اور جسم ہر وقت ایک پھریری سی لیا کرتا ہے۔ کبھی کبھی ایک آدھ چرائی ہوئی سنسنی رات بھر پکپاتی لجاتی رہتی ہے۔ اور کوئی مبہم سا اشارہ تو من کے دامنوں سے چپک کر دل تڑپاتا رہتا ہے۔ اور جسم کا ذرا سا لمس خوابوں کے اُن جزیروں کی جانب لے جاتا ہے جہاں انسان دم سادھے گم سُم پڑا رہتا ہے اور سوچتا رہے۔ اور خواہش کرتا رہے۔ اور سلگتا رہے اور جسم ٹوٹتا رہے۔

اُس روز وہ دوسرا شو سنیما دیکھ کر آئے۔ اندھیرے کا سہارا لے کر وہ ساجدہ کو تلاش کرتے ہوئے فریدہ کی چارپائی کے پاس آکھڑے ہوئے۔ فریدہ دیکھ رہی تھی کہ اندھیرے میں ایک پیکر اُس کی جانب بڑھتا آ رہا ہے۔ ایک جوان پیکر۔ آدھی رات اِدھر۔ آدھی اُدھر۔ جوان تنہائی۔ وہ ایک عجیب جذبے سے دم روکے بستر پہ پڑی رہی۔ اس جذبہ میں خوف بھی تھا۔ ڈر بھی تھا۔ دھڑکا بھی تھا اور مسرت تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے شرارے سے اُڑ رہے تھے۔ وہ اُس کے بستر کے قریب کھڑا تھا چند ثانیے۔ اور ان چند ثانیوں میں اُس کا دل لاکھوں بار سینے سے باہر نکلنے کے لئے تڑپا۔ وہ دبکی سی۔ سہمی سی۔ نیم وا آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہی۔ دیکھتی رہی۔ پھر وہ نہایت آہستگی سے اُس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں اُس کا جسم ڈوب گیا۔ ایک عجیب سے خوف سے

فریدہ کا دل اُچھلنے لگا۔ نہ جانے وہ کیا کرے گا؟ نہ جانے وہ کیوں آیا ہے؟ نہ جانے یہ کیسا جذبہ ہے — .... نہ جانے — ....

پھر اُنھوں نے ایک ہاتھ بڑھایا۔ اور اُس کے بالوں میں اُنگلیاں کرنے لگے۔ کبھی کبھی گالوں کو چھوتے۔ تو جیسے سانپ رینگنے لگتے۔ کبھی کبھی ہونٹوں کو چٹکی میں پکڑ کر مسل دیتے۔ اور فریدہ چپ چاپ بے دم سی کپکپاتی رہی۔ لرزتی رہی۔ سلگتی رہی جیسے نیند کے ہلکوروں میں خوابوں کے ساحلوں تک پہنچ گئی ہو۔

پھر ایک صبح اُنھوں نے فریدہ کے چہرے پر دھوئیں کے مرغولے چھوڑے۔ اردگرد کوئی نہ تھا۔ فریدہ زیرِ لب دھیرے سے منمنائی۔ اور پھر اُس نے دیکھا کہ وہ ہونٹوں میں سگرٹ دابے اسے سلگا دینے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ اُس کا کلیجہ کانپا۔ یہ تنہائی — وہ لاشعوری طور پر کھنچی ہوئی چلی گئی۔ ماچس جلائی اور جونہی اُن کے اوپر جھکی۔ اُنھوں نے بس کھینچ کر اپنے اوپر ہی تو گرا لیا۔ اور وہ جو گھبرا کے بھاگی ہے سرپٹ۔ اِس جا — اُس جا —

اور پھر ایک شام کے دھندلکے میں سیڑھیوں کی موڑ پر یکایک سامنے آکر اُس کے ہاتھ کو پکڑ لیا۔ اور وہ کانپ اُٹھی۔ سینہ میں ایک لرزش سی پیدا ہوگئی اور اُس روز کے بعد وہ سیڑھیوں میں جب بھی ملتے۔ اُس کے ماتھے پر پڑی ہوئی ایک لٹ ضرور ہی سنوار دیتے۔ اور پھر ایک بار ——....

مگر وہ چلے گئے۔ وہ جانے کے لئے آئے ہی تھے۔ مگر فریدہ کے دل میں آرزوؤں کی نئی دنیا آباد کر گئے۔ جب وہ جا رہے تھے اُنھوں نے کچھ نہ کہا۔ بس اُداس نظروں سے دیکھتے رہے۔ ان نظروں میں حسرت تھی۔ تمنا تھی۔ آرزو تھی۔ التجا تھی۔ تڑپ تھی۔ مگر اُنھوں نے جانا تھا۔ اور وہ چلے گئے۔ ساجدہ بہن نے تنہائیوں میں چند آنسو بہائے اور معمول کے کاموں میں مصروف ہوگئی۔ مگر اس کے لئے گویا خزاں چھا گئی۔ اور دنیا اب گوں ہوگئی۔ چودھویں کا جوان مہتاب بے نور ہوگیا اور ایک اندھیرا چھا گیا۔ لامحدود حدوں تک ——....

ساجدہ اور جمیلہ لڑائی اور جھگڑے میں وقت کاٹنے لگیں۔ اپنے اپنے خاوندوں کے پرانے سوئٹر اُدھیڑ کر اُن کی اُون سے جرابیں بننے لگیں۔ دق کی مریض بڑی بھابھی کمرے میں پڑی کھانستی رہی۔ بڑے بھیا جن سے سب نفرت کرتے تھے۔ اُن کے آگے پیچھے ہوتے رہے۔ اور امّی بے شُگم سے احکام دیتی رہی!

مگر زندگی کس طرح کٹے؟ یہ اُداسی اور یہ جمود کس طرح ٹوٹے؟

پھر ایک صبح جب وہ ابھی ابھی نہا کر انگڑائی لے رہی تھی۔ اُس نے سنا کہ اصغر گا رہا ہے:

میری محبوبہ کا جسم ایک ناؤ ہے۔

وہ لپک کر آئی۔ اور اُس نے ٹوٹے کواڑوں کی جھری سے اُسے دیکھنے کی کوشش کی۔ خوب صورت جسم۔ لمبا قد۔ آنکھوں پر سنہری عینک — پریشان شاعرانہ بال — اسے اس کی صورت نہایت اچھی لگی اور وہ چھپ چھپ کر اُسے دیکھتی رہی۔

اور پھر مرکز پر جاگی جوانی! اب اُس کا یہی معمول بن گیا۔ کہ موقع بے موقع لپکی اوپر آئے۔ اور دروازہ اندر سے بند کر دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ اصغر کو دیکھنے کی کوشش کرے۔

آہستہ آہستہ اُسے اس بات کا بھی احساس ہوتا گیا کہ اصغر بھی نہایت اشتیاق سے اُس کا منتظر رہتا ہے۔ گھر سے باہر بھی نہیں نکلتا۔ جونہی وہ آتی ہے وہ کھڑا ہو کر دروازے کے قریب آجاتا ہے۔ اور اُسے حد درجہ مسرت محسوس ہوتی۔ جیسے وہ ہوا کے پروں پر اڑی جا رہی ہے۔ کتنے خواب اپنے جلو میں سمیٹے — آخر راہ لگ گئے ناکارواں؟

اُس روز اباجان چپکے سے سرگوشی کے انداز میں کہہ رہے تھے۔ "یہ فریدہ تو ایک دم سے اتنی بڑی ہو گئی ہے اور یہاں ہاتھ میں پیسہ نہیں۔ کم از کم دو برس تک تو اس کا نکاح کہیں ہو ہی نہیں سکتا —"

دو برس —؟ اوئی اللہ — اس قدر طویل عرصہ —؟ تو دو برس بعد اسے ایک ساتھی سونپا جائے گا؟ تب اس طویل عرصہ میں وہ اپنے دن کس طرح کاٹے گی؟ — یہ سنسان اُداس، اکیلے دن؟

اور جب اُس روز وہ کوٹھے پر گئی ۔ تو وہ اصغر کی نظروں سے جھینپی نہیں بلکہ جرأت کر کے اُس نے اُس سے نظریں بھی ملائیں اور ذرا سی مسکرائی بھی ـــــــ

دراصل اب اُسے غرور ہو گیا تھا کہ اصغر اُس کا اپنا ہے ۔ اور عورت کے لئے یہی غرور کافی ہے ۔ اسے نیچے تو ایک ثانیہ کے لئے بھی آرام نہ آتا تھا ۔ کبھی کسی کام میں اُلجھی بھی تو دل و دماغ اوپر اٹکے ہوئے ہیں ۔

چنانچہ جوتھے روز جب کنکر سے بندھا ہوا کاغذ کا ایک ٹکڑا جھری کی راہ سے اندر آ گیا ۔ تو اُس کے لئے ہر جانب چاندنی راتوں کا نور بکھراں چھا گیا ۔ طوفان اُمڈ آئے ۔ کلیجہ کانپنے لگا ۔

اور ایک بار پھر سے فضا جوان ہو گئی ۔ چاند محبت کا امین بن گیا ۔ دو جوانیاں مہکنے لگیں ۔ اصغر کا خط آتا ۔ اور فریدہ آدھی رات کو دیا سلائی جلا کر اُس کا جواب لکھتی ـــــــ

اور پھر ایک روز ـــــــ

شام کے دھندلکے میں کواڑ کی آڑ سے اصغر کو ایک خط ملا جسے پڑھ کر وہ جھوم اُٹھا ۔ لکھا تھا کہ جمعہ کے روز فریدہ کے ہاں مولود شریف ہے ۔ گھر میں بہت سے مہمان آئیں گے ۔ آدھی رات کے قریب فریدہ کسی بہانے سے اوپر آ جائے گی اور اندھیرے

میں موقع دیکھ کر اصغر پچھواڑے کی منڈیر پر آجائے۔

——— اور دنیا اور سماج کی اتنی بندشوں کے باوجود اُس رات دو چار منٹ نہیں پورے پندرہ منٹ فریدہ اصغر کی آغوش میں منڈیر سے لگی سلگتی رہی۔ خوف اور خواہشات کے ملے جلے جذبات فضا پر طاری رہے۔ اور فریدہ کا کلیجہ کانپتا بجتا رہا۔ مگر اس چوری میں جو لذت تھی وہ بدنامی کے خوف سے کہیں بالاتر تھی۔ اس گھر میں جہاں پرائے مرد کا سایہ بھی نہیں رینگ سکتا تھا۔ وہاں ان گنت نگاہوں کے سایے تلے اُس نے اصغر کو اپنے پاس بلالیا۔ کاغذ پر دو سادی لکیریں کھینچنے سے جس گھر میں سوالات کی بوچھار ہو جایا کرتی تھی۔ کیا لکھا؟ کیوں لکھا؟ کیسی غزل ہے؟ خبردار جو آئندہ کوئی غزل لکھی ——— وہاں پر اتنی ہمت کرنا ———؟ فریدہ اپنی اس فتح پر بحید نازاں ہے۔ اُس نے دنیا اور دنیا والوں کی تمام بندشوں کو توڑ کر اپنے جسم کی واضح پکار کو منزل تک پہنچا دیا امّاں اسے گانے نہیں دیتیں کیوں کہ اس کی آواز سب سے اونچی ہو جاتی ہے ۔ بھابھی اسے اپنے گھر نہیں لے جاتیں۔ کیوں کہ اُس کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کی وہاں ازحد تعریف کی جاتی ہے۔ ساجدہ اسے دولھا بھائی کے خط تک پڑھنے نہیں دیتیں۔ نہ دیں۔ کیا وہ کوئی ہستی نہیں رکھتی کیا وہ ہمیشہ کوٹھری میں گھُٹنے کے لئے پیدا ہوئی تھی؟ کہاں ہے ماں! دیکھے اب! کہاں ہے بھائی کی اونچی ناک، جس نے مچلتی جوانی کو گھر کی چہار دیواری میں مقید کر دیا۔ جس نے دودھ کے اُبال کو پانی کے چھینٹے سے ٹھنڈا کرنے کی اجازت بھی نہیں دی۔ کہاں ہیں۔ اباجان جو دو برس تک اس کی شادی نہیں کر سکے ——— کہاں ہیں ——— ....

لیکن ایک روز سب ختم ہو گیا ۔ آسمان کا چاند ڈوب گیا اور بادل چھا گئے ۔ اور پانی برسنے لگا ۔ فریدہ اوپر کی چھت پر چارپائی اُتارنے دوڑی گئی ۔ اوپر اصغر بھی آ گیا ۔ اور وہ ابھی اصغر کی آغوش میں کسمسا ہی رہی تھی کہ اوپر چھوٹا چچا آ گیا اور اُس نے اصغر کے منھ پر گھونسا مار دیا ۔ اور فریدہ کو بالوں سے پکڑ کر سیڑھیوں میں ڈھکیل دیا ۔ اور تب ایک طوفان اُمنڈ آیا ——— سسکیاں اور آنسو اُس کے گلے میں گھٹ کے رہ گئے ۔ سسکتی ہوئی جوانی کوٹھری میں ڈھکیل دی گئی اور دنیا اُسے گالیاں دینے لگی ۔ اور اُس کا دل اندر ہی اندر روتا رہا ۔

اور اب دنیا کتنی محدود ہو گئی ہے ؟ ——— تین کوٹھریاں اور ایک اونچی دیوار ——— بس سر نیچا کیے روٹی پکاؤ اور برتن صاف کرو ۔ کسی کام کی آزادی نہیں ہے ۔ سب ٹکر ٹکر دیکھا کرتے ہیں ———

اور وہ حیران ہے کہ یہ سب کچھ اُس کی بھابھیاں بھی تو کرتی ہیں ——— سب کرتے ہیں ۔ ساجدہ کرتی ہے اور بڑے بھیا اور بڑی بھابھی ۔ اور اُس کی دوسری سہیلیاں ——— انھیں کسی نے کچھ نہ کہا ۔ اُلٹا ہر ایک آنکھ بچا جاتا ہے ۔ پھر یہ سب طوفان اُسی پر کیوں نازل کیے گئے ؟

اب کیا ہے —— دو سال بہت لمبے ہوتے ہیں۔ انتظار کرو کہ وہ کٹ جائیں۔ مگر آخر کبھی نہ ملنے والی چیز میں کتنے دن گزارے جا سکتے ہیں؟

سنا ہے کہ عید کی چھٹیوں میں چھوٹے دولھا بھائی آنے والے ہیں۔ فریدہ اب اُن ہی کا انتظار کر رہی ہے۔

اپنی بات

اس سے پہلے میرے دو ناول اور ایک افسانوں کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میرے یہ دونوں ناول اُردو کے سب سے بڑے اشاعتی ادارے "شمع بک ڈپو" کی وساطت سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ ادارہ ادب کو جس خوب صورتی سے پیش کرتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ "جلن" اُردو زبان کی پہلی کتاب ہے جسے لیتھو کے عام طریقہ کی بجائے "فوٹو آفسٹ" کے نئے اور خوب صورت طریقے پر طبع کر کے اُردو کی بقا اور فروغ کے راستہ پر ایک نیا اور قابلِ قدر قدم اُٹھایا گیا تھا۔ طباعت کا یہ نیا طریقہ بیحد مہنگا، مگر انتہا درجہ جاذبِ نظر اور حسین ہے اس طریقے پر چھپی کتابوں کو ہم کسی بھی دوسری زبان کی کسی بھی دوسرے طریقے سے شائع شدہ کتاب سے بدرجہا زیادہ دیدہ زیب پائیں گے۔ "جلن" فوٹو آفسٹ کے طبع ہونیوالی پہلی کتاب ہونے کی وجہ سے اُردو صحافت اور طباعت کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائیگی۔ اس کے لئے میں "شمع" والوں کا ممنونِ منت ہوں۔

"جلن" اور "گھائل" کی طرح میرے یہ افسانے بھی محروم، ناشاد، نامراد، اور ناکام انسانوں کے افسانے ہیں۔ محبت کی ناکامی میرا مقدر رہا ہے۔ زمانے میں جو کچھ میں نے چاہا مجھ سے چھین لیا گیا۔ ہر چیز جس کی جانب میں لپکا۔ مجھ سے دور ہٹ گئی۔ اس شکست نے جہاں مجھ سے

میری زندگی کی دلچسپیاں چھین لیں۔ وہاں ردِ عمل کے طور پر مجھے آوارہ اور اوباش بھی بنا دیا۔ میں نے زمانے سے زبردستی وہ سب کچھ حاصل کرنا چاہا جو مجھے کبھی نہ ملا۔ مگر میرا ہر قدم غلط پڑا۔ میری ہر آرزو اس لہر کی طرح ثابت ہوئی جو ساحل سے ٹکرا کر کبھی تو لوٹ آتی ہے اور کبھی پاش پاش ہو جاتی ہے۔

پھر میری چھبیس[26] سالہ زندگی میں میری جذباتیت ہر آن ہر لمحہ، میرے لئے سدِ راہ بنی۔ جذبات کی گرفت میں اپنے لئے کبھی کوئی اہم فیصلہ نہ کر سکا۔ چنانچہ جو کچھ میسر بھی ہوا۔ میری اپنی بزدلی۔ کم ہمتی اور جذباتی پن نے مجھ سے چھین لیا۔ اور میں ہمیشہ تشنہ، دل گرفتہ، اور مایوس ہی رہا۔

چنانچہ میرے کردار بھی ایسے ہی نامراد انسان ہیں۔ ان کے ساتھ ہمیشہ میں نے انصاف کرنے کی کوشش کی۔ مگر میری اپنی زندگی کے ردِ عمل کے طور پر ان میں جگہ جگہ میرا پرتو جھلکنے لگتا ہے۔

مگر مجھے محسوس ہوتا ہے، میں اکیلا ہرگز نہیں، میرے ساتھ ہزاروں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ہیں۔ وہ انسان ہیں جن کے جوان سینوں میں ان کی آرزوئیں گھٹ کر دفن ہو جاتی ہیں۔ وہ اس گہرے درد سے آشنا ہیں جو مجھے حاصل ہوا ہے۔ جو آپ کو حاصل ہوا ہے۔ جو ہر اس انسان کو حاصل ہوا ہے۔ جس نے کبھی کچھ چاہا۔ میں اس درد کا مداوا چاہتا ہوں۔ بے چین اُردوں کے ناتمام گیتوں کی سُر چاہتا ہوں۔ دل کی کسک۔ تمنا کی بیتابی اور خوابوں کی تعبیر چاہتا ہوں۔ اس مسرت کو چاہتا ہوں۔ جس کے لئے انسان ازل سے سرگرداں ہے۔ مجھے اس ناآسودگی میں چین نہیں ملتا۔ میں اپنے غم سے، آپ کے غم سے، ٹھکرائے ہوئے دلوں کے غم سے، سارے زمانے کو روشناس کرانا چاہتا ہوں۔

میں ایک پکار بن جانا چاہتا ہوں۔ ایک ایسی بانگ کہ جس سے کائنات کا سینہ دہل جائے۔

لوگ مجھ سے کہتے ہیں "تم ہمیشہ عشق، محبت اور عورت کے بارے میں لکھتے ہو۔ اس طریقے سے تم ادب میں کبھی جگہ نہ بنا پاؤ گے۔ آج کا انسان کچھ اور چاہتا ہے۔ تم اُس کے تقاضے پورے کرو۔" میں اُن کی باتوں کے جواب میں چپکے سے کہہ دیتا ہوں "ابھی میری عمر ہی ایسی ہے۔ کہ محبت کے سوائے میں کچھ اور سوچ ہی نہیں پاتا۔ کبھی سنجیدہ ہو کر میں نے روٹی کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ اس عمر میں ہر انسان کے حواس پہ عورت سوار رہتی ہے۔ اس لئے اگر میں صرف عورت کے بارے میں لکھتا ہوں، تو کیا گناہ کرتا ہوں۔ میں اپنے اندر کی آواز سے کیسے منھ موڑ سکتا ہوں؟ ہاں! ذرا عمر ڈھلنے پر، ذرا سنجیدہ اور باوقار ہونے پر، ممکن ہے میرے خیالات کا بہاؤ اپنا رُخ بدل ڈالے۔ ابھی تو میں نوعمر لڑکا ہوں۔ مجھے عورت ہی کے بارے میں لکھنے دو۔"

اور پھر جب کبھی کبھی ان کے تقاضے بڑھ جاتے ہیں۔ تو میں چلا اٹھتا ہوں۔ "کیا عورت اور محبت انسان کی ضروریات نہیں ہیں؟ کیا مسرت روح کی غذا نہیں۔ کیا وہ اتنی اہم نہیں، جتنی اور مادی چیزیں۔؟ کیا انسان درد و غم کے بغیر ادھورا نہیں؟ مجھے مادی اور سطحی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تو انسان کے لاشعور سے اُلجھتا ہوں اور ادب ______؟ مجھے کچھ بھی علم نہیں ادب میں میرا کیا درجہ ہے؟

______ میں تو صرف لکھتا ہوں کہ ان چیخوں، ان کراہوں کو، جو میں اپنے چاروں اُور سنتا ہوں، نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ان بھوکی، ننگی، بے چین اور

ناآسودہ نگاہوں سے اپنا منہ نہیں موڑ سکتا۔ خاموش نگاہوں سے جو چیخیں بلند کی جاتی ہیں، وہ میرا سینہ چیر ڈالتی ہیں۔ اور میرا غم جاگ اُٹھتا ہے۔ میں لکھتا ہوں تاکہ اس غم کو تھپکیاں دے دے کر سلا سکوں۔ اس وقت میرے پیش نظر ادب اور ترقی پسندی سے کہیں زیادہ ایسی عورت کی نگاہیں ہوتی ہیں۔ جو صرف آنسو بہانا جانتی ہیں۔ اور میں برملا کہتا ہوں کہ مجھے ادب میں اپنے درجہ اور مقام سے کہیں زیادہ اس عورت کی نگاہیں عزیز ہیں۔ درد سے بھرے ہوئے سینوں کے راز عزیز ہیں۔ اور اس مسرّت کی تلاش عزیز ہے۔ جو انسان سے کھو گئی ہے۔

کرشن گوپال عابد

کانپور۔
۱۱ر ستمبر ۱۹۵۶ء